(طنز و مزاح)

چچا عبدالباقی

محمد خالد اختر

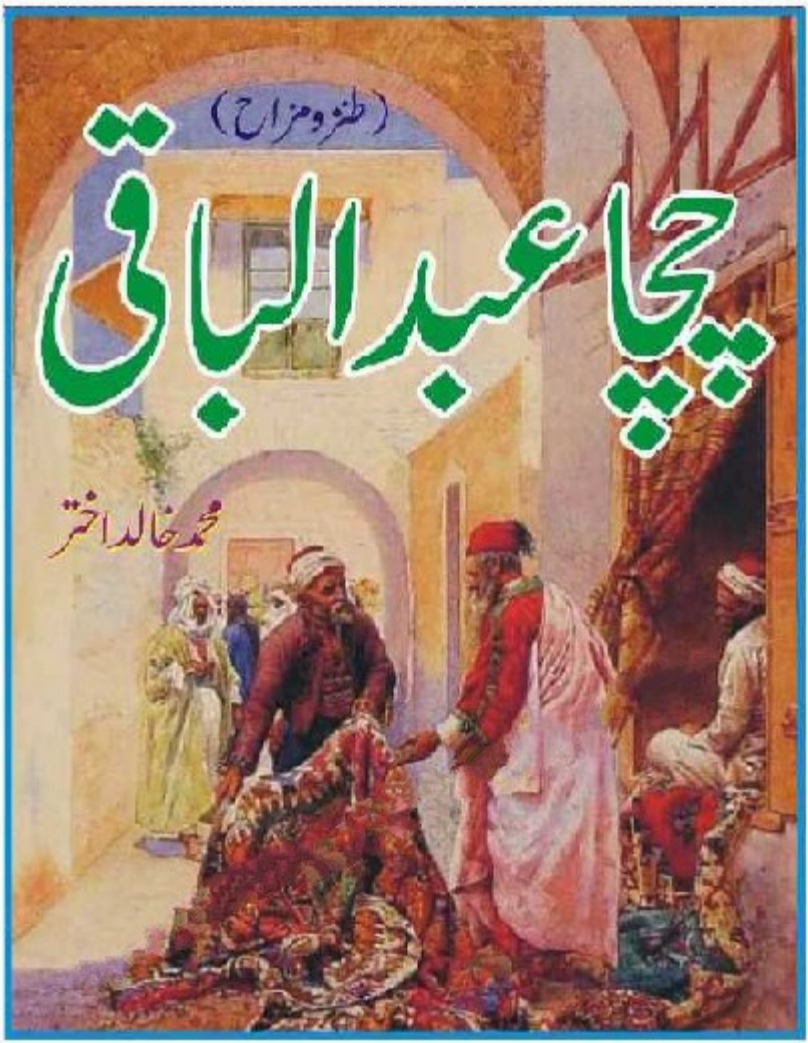

چچا عبدالباقی

(طنز و مزاح)

محمد خالد اختر

ماہنامہ ''الو'' کا اجرا

اگر آپ کبھی ایک چھوٹے گول مٹول سے آدمی کو دیکھیں جس نے ایک چیک ڈیزائن کا سوٹ پہن رکھا ہو' جس کی جیبی گھڑی کی زنجیر اپنی آب کھو چکی ہو جس کے کوٹ کے کالر کے سوراخ میں ایک بڑا سرخ گلاب لگا ہوا ہو' جس کے بغیر فریم کے چوکور چشموں میں سے دو معصوم' بوکھلائی ہوئی سی آنکھیں جھانکتی ہوں جس کا چہرہ ایک دودھ پیتے بچے کی طرح بے ریا اور پاک ہو اور جس کے سر پر اس کے کالر کے گلاب سے زیادہ سرخ ایک جھومتے ہوئے پھندنے والی ترکی ٹوپی ہو تو فوراً جان لیجئے کہ یہ میرا چچا عبدالباقی ''بی اے' ایل ایل بی'' ہے۔ وہ میرا اصل چچا نہیں ہے بلکہ ان چچاؤں میں سے ہے جو اپنے قابل قدر مشوروں اور بیش قیمت نصیحتوں سے زندگی کے کڑے سفر کو خوشگوار اور قابل برداشت بناتے رہتے ہیں۔ ان چچاؤں کے بغیر زندگی مطلقاً بے رنگ اور بے معنی سی شے ہے اور جینا محض ایک تضیع اوقات۔

چچا عبدالباقی کئی گنوں کا مالک ہے۔ اگر آپ نامساعد حالات میں بے کاری کے چکر میں ہیں اور بڑی مشکل سے اپنے باپ کے ماہانہ الاؤنس پر زندگی کی گھڑیاں گزار رہے ہیں یا اگر آپ فوراً دولت مند بننے کے خواہش مند ہیں تو آپ کو چچا عبدالباقی سے ملاقات کرنی چاہیے۔ اس کے پاس ایسی ان گنت قیمتی تجویزیں ہیں جن پر عمل کر کے آپ گھر بیٹھے بٹھائے پانچ چھ سو روپے ماہور پیدا کر سکتے ہیں۔ سرمایہ آپ کا ہوگا۔ چچا عبدالباقی صرف آپ کے ساتھ آدھے کا حصہ دار ہوگا اور اس کے بدلے میں وہ آپ کے لیے بزنس کی باقاعدہ تنظیم کرے گا' اس کو چلائے گا۔ آپ سب کچھ اس پر چھوڑ سکتے ہیں۔ چچا عبدالباقی کی کاروباری سکیمیں عموماً ایک ڈیڑھ سال تک آمدنی دینے لگتی ہیں۔ اس لیے اگر آپ صبر اور استقلال سے اس عرصے تک اپنے باپ کا سرمایہ لگانے کی ہمت رکھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی آپ کے قدم نہ چومے۔

مولوی نوردین کے فرضی نام سے چچا عبدالباقی نے ایک کتاب تصنیف کی ہے جسے مولوی نوردین اینڈ سنز' پبلشرز نے مع حاشیہ وضاحتی تصاویر کے زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔

اس کتاب کا نام ہے۔ ''روپیہ پیدا کرنے کے ایک ہزار طریقے'' اور پانچ روپے کا منی آرڈر مولوی نوردین اینڈ سنز کو بھیجنے سے اس کتاب کو گھر بیٹھے بٹھائے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے (اس کا دیباچہ میں نے لکھا ہے)

اگر چہ خود دولت نہیں کما سکا اور ایک غیر یقینی آسودہ حالی سے زیادہ کچھ حاصل نہیں کر سکا تو اس کی وجہ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس نے ساری عمر دوسروں کو یہ سمجھانے میں گزار دی ہے کہ وہ دولت کیونکر پیدا کر سکتے ہیں۔ بقول خود اس نے اپنی زندگی کو دوسروں کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اس نے ہر قسم کے پاپڑ بیلے ہیں۔ چمڑے اور ہڈی سے لے کر نمک اور مچھلی تک کا دھندا' مرغیوں کی فارمنگ اس نے کی ہے جو بقول اس کے' اس کے شرکاء کار میں تخیل کے فقدان اور بعض سرمایہ دار حضرات کی ہچکچاہٹ اور پست ہمتی کی بدولت ناکامی ہوگئی اور آخر میں اس کو وہ سب مرغیاں ایک ایک کر کے خود کھانی پڑیں۔

ایک بار اس نے ایک انوکھی تجویز بنائی جس میں وہ مجھے شرکت پر اکسانے میں کامیاب ہو گیا میں اس کا ذکر اس واسطے کر رہا ہوں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ چچا عبدالباقی کی سکیمیں کتنی اعلیٰ اور پر جدت ہوتی ہیں اور کیسے وہ آدمی کے تخیل کو چکا چوند کر دیتی ہیں۔ اس کی سکیم یہ تھی کہ افریقہ سے زیبروں کو درآمد کر کے ان کو یہاں پالا پوسا جائے اور انہیں تانگے اور وکٹوریا کے آگے جوتنے کے لیے سدھایا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح پانچ مہینے کے اندر اندر کراچی کی سب وکٹوریاؤں کے آگے بھورے سرخی مائل مریل گھوڑوں کی بجائے دھاری دھار کوٹوں والے چنکبرے اور چاق و چوبند زیبرے جتے ہوئے نظر آنے لگیں گے اور گھوڑوں کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔

''بھتیجے بختیار خلجی!'' اس نے اپنی چھوٹی ٹانگوں کو سامنے کرسی پر پھیلاتے اور اپنی چوکور عینکوں میں سے دور ایک حسین خواب دیکھتے ہوئے مجھے کہا تھا'' ذرا سوچو اگر وکٹوریا والوں کو بھورے مریل گھوڑوں کی بجائے' دھاری دار خوبصورت زیبرے جوتنے کے لیے مل جائیں تو وہ بھلا گھوڑوں کو کیوں خاطر میں لائیں گے۔ پھر زندگی کیسی خوشگوار ہو جائے۔ ہم اگر یہاں زیبروں کا ایک فارم بنائیں اور ان کی پرورش شروع کر دیں تو سال میں لکھ پتی بن سکتے ہیں۔ مثلاً فرض کرو سال کے اخیر میں ہمارے پاس دو سو زیبرے بھی ہوں۔ میں کم سے کم تخمینہ لگا رہا ہوں۔ ممکن ہے ہمارے پاس دو ہزار زیبرے ہوں۔ اب اگر ہم ایک زیبرے کو پانچ سو روپے میں بھی فروخت کریں تو حساب لگاؤ ہم کتنا کما سکتے ہیں۔ یہ پنسل اور کاپی تمہارے پاس فرش پر پڑی ہے۔ ذرا اس پر حساب کرو۔ (یہ پنسل اور کاپی چچا کے بڑے لڑکے عبدالرحمان کی ہے جو ساتویں جماعت میں پڑھتا ہے اور ابھی کسی کام کو باہر گیا تھا اور زیبروں پر ہماری لاگت کیا آئے گی؟ قریباً کچھ بھی نہیں۔ افریقہ میں ان کے گلے کے گلے ہمارے منتظر ہیں۔ صرف ان کو وہاں جا کر پکڑنے کی ضرورت ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہمارے ذمے ان کو جہاز پر یہاں کراچی لانے کا خرچہ پڑے گا۔ اور میرا خیال ہے زیبروں پر درآمد کا محصول تو غالباً نہیں ہوگا۔ وہ سامنے میز پر محصولات کی کتاب رکھی ہے۔ اگر ہو بھی تو بھلا مفت چیز پر کیا محصول لگ سکتا ہے۔ تمہیں دو

تین مہینے کے لیے نائجیریا جا کر خود زیبروں کی فراہمی اور شپنگ کا انتظام کرنا ہوگا۔''

تو اس قسم کا آدمی ہے میرا چچا عبدالباقی۔ یہ زیبروں کا قصہ تو میں پھر کبھی سناؤں گا۔ یہاں میں چچا اور اپنی ایک مشترکہ ''مہم'' کی سرگزشت پیش کروں گا کہ کیسے ہم نے ماہنامہ ''الو'' کا اجراء کیا اور کس طرح بعض غیر ذمے دار لوگوں کی سازش سے ''الو'' اپنے حسرت ناک انجام کو پہنچا اور اردو ادب اس کی خدمات سے بہرہ ور نہ ہو سکا۔ یہ ایک بڑی دردناک داستان ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ چچا کو ماہنامہ ''الو'' کے اجراء کا خیال کیسے سوجھ گیا۔ غالباً یہ سکیم ایک عرصے سے اس کے دماغ میں پختہ ہو رہی تھی۔ جب سے اس نے وہ کتاب ''روپیہ کمانے کے ایک ہزار طریقے'' عرف ''کیا آپ نکھٹو ہیں؟'' تصنیف کی ہے وہ اپنے آپ کو ایک ادبی شخصیت سمجھتا ہے اور اس کے دماغ میں یقین پیدا ہو گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو ایک اعلیٰ پائے کا رومان نگار، نقاد اور غزل گو بن سکتا ہے۔ ''الو'' کے اجراء سے پہلے اس نے وقتاً فوقتاً اپنے رشحات قلمی مختلف رسالوں کے ایڈیٹروں کو بغرض اشاعت بھجوائے تھے۔ ان میں سے بعض واپس آ گئے تھے اور بعضوں کو ایڈیٹر صاحبان پی گئے تھے۔ چچا عبدالباقی کو اس کا بے حد غصہ تھا اور شاید اسی وقت اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے مضامین کو چھپوانے کا بہتر اور یقینی طریقہ یہ ہے کہ خود اپنا ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا جائے۔

ایک شام جو میں اس کے ناروجی روڈ والے مکان میں ملنے گیا تو اس نے اس موضوع کو چھیڑ دیا۔

''بیٹھو بھئی بختیار!'' اس نے مجھے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کئی دن سے تمہارا منتظر تھا۔ تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ہمیں ایک ادبی ماہنامہ جاری کرنا چاہیے۔ اگر تم کچھ روپیہ کمانے کے آرزومند ہو تو میری اس ''ادبی مہم'' میں حصہ دار بن سکتے ہو۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں، چچا۔'' میں نے کہا ''ماہنامے کا نام کیا ہوگا؟''

''الو!'' چچا عبدالباقی نے کہا۔

''یہ تم مجھے کہہ رہے ہو۔ میں نے ایک شکایت بھرے لہجے میں احتجاج کیا۔'' ''چچا! تم سے مجھے یہ امید نہ تھی۔''

''نہیں، الو ماہنامے کا نام ہوگا۔ میں نے پہلے ''چغد'' سوچا تھا۔ مگر وہ زیادہ عام فہم نہیں۔ ماہنامے کا نام عام فہم ہونا چاہیے۔''

میں نے اتفاق کیا کہ واقعی الو بے حد عام فہم ہے، مگر غیر موثر سا احتجاج کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ نام ایک ادبی ماہنامے کے لیے غیر موزوں اور عجیب سا ہے۔''

''عجیب ہونا ہی تو اس کی ایک خوبی ہے۔ یہ نام ہی لوگوں کو چونکا دے گا اور پھر جب دوسرے پرندوں کے نام پر دوسرے ادبی

ماہنامے موجود ہیں۔ مثلاً مولوی غریب احمد کا ''شاہیں'' ہے۔ حکیم الطاف حسین کا ''طاؤس'' ہے تو الو کے خلاف یہ بے جا تعصب کیوں؟ الو غریب نے آخر کون سا قصور کیا ہے۔''

میں نے کہا الو ایک منحوس پرندہ سمجھا جاتا ہے۔ الو ایک گالی ہے۔''

''یہ ہم اہل مشرق کا الو کے خلاف بے جا تعصب ہے۔'' چچا عبدالباقی نے گرم جوشی سے الو کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ ''انگلستان وغیرہ میں جو الو کی قدر و منزلت ہے وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ وہاں تو اسے پرندوں کا لقمان سمجھا جاتا ہے اور اگر کسی شخص کی دانائی کی مثال دینی ہو تو اسے الو سے دی جاتی ہے۔ مثلاً فلاں الو کی طرح سیانا ہے۔ وہاں انگلستان میں یہ تمہارے شاہیں وغیرہ کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ شعر و شاعری میں' فسانہ و رومان میں ہر جگہ الو کا چرچا ہے۔ ہر جگہ الو کا بول بالا ہے مگر میرے اس نام کے انتخاب کرنے کی محض یہی وجہ نہیں۔ بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نام میں جدت ہے انوکھا پن ہے لوگوں کو چونکا دینے کی قدرت ہے۔''

چچا عبدالباقی ''جدت'' پر لٹو ہے۔

میں نے پھر اپنے شکوک کا اظہار کیا۔ ''لوگ اس کو قبول نہیں کریں گے بلکہ مجھے تو ڈر ہے کہ پریس برانچ والے ہمیں اس کا اجازت نامہ ہی دینے سے انکار کر دیں گے۔''

میرے چہرے سے نارضامندی کے آثار واضح ہوئے ہوں گے۔ انہیں بھانپ کر چچا عبدالباقی نے معاملے کو نبٹا دیا۔

اس نے کہا ''دیکھو' بختیار! اس طرح بحث کرنے سے کسی بات کا تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ اس جمہوریت کے زمانے میں ہمیں رائے دہندگی سے ان امور کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ جس میں ہمیں اختلاف ہو۔''

''منظور' چچا۔'' میں نے کہا۔ ''مگر تیسرا اور فیصلہ کن ووٹ کس کا ہوگا؟''

''تم نہیں سمجھتے۔ ہم ایک کمیٹی ہیں۔ اب ہر کمیٹی کا ایک صدر ہوتا ہے۔ اس کمیٹی کا صدر میں ہوں۔ میرے خیال میں تمہیں اس پر اعتراض نہ ہوگا۔ اب میرے دو ووٹ ہیں۔ ایک تو میرا ذاتی ووٹ اور ایک میرا صدارتی ووٹ۔ میں اپنا ذاتی ووٹ اور فاضل ووٹ بھی الو کے حق میں دیتا ہوں۔ دو حق میں۔ ایک خلاف۔ قرارداد پاس۔''

''پاس۔'' میں نے بوکھلاہٹ میں تالی بجاتے ہوئے کہا۔

''اب ہم کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس ماہنامے کا پبلشر اور ایڈیٹر کون ہوگا۔'' چچا عبدالباقی نے خوش ہو کر کہا۔

''تم' چچا۔'' میں نے قیافہ لگایا کہ وہ یہ اعزاز اپنے لیے چاہتا ہے۔ یقیناً میں یہ اعزاز نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنا نام ماہنامہ ''الو'' کے پہلے

صفحے پر دیکھنے کا خواہشمند نہ تھا۔ میں پس پردہ رہنا چاہتا تھا۔"

"میں اس کا سرپرست ہوں۔" چچا عبدالباقی نے فراخدلی سے کہا۔ "اس کے پبلشر اور ایڈیٹر تم ہو گے۔"

"میں! میں!" میرا منہ کھلا رہ گیا۔ "تم خود ہی سرپرست' پبلشر اور ایڈیٹر کیوں نہیں ہو سکتے؟ میں "الو" نام کے ماہنامے کا پبلشر اور ایڈیٹر! چچا عبدالباقی میرے دوست اور احباب اچھے معزز لوگ ہیں جیسا کہ تمہیں معلوم ہے۔ دو تین بزرگ اپنی لڑکیوں کے رشتے کے سلسلے میں مجھ میں دلچسپی لے رہے ہیں اور وہ بزرگ اچھے مالدار ہیں۔ خود سوچو! "الو" کے ساتھ اپنا نام منسلک کرنے کے بعد کیا میرے احباب رفتہ رفتہ میرا ساتھ چھوڑ نہ دیں گے۔ کیا وہ بزرگ مجھ کو اپنی فرزندی میں لینے کے لیے ذرہ بھر بھی مشتاق رہیں گے۔ چچا عبدالباقی! خدا اور رسول کے نام پر میری زندگی تباہ نہ کرو۔ ابھی تو میں نوجوان ہوں۔ تم میرے دشمنوں کو نہیں جانتے۔ میرا نام ہی "الو" پڑ جائے گا۔ گلی میں جاتے وقت سکول کے بچے ایک دوسرے سے میرے بارے میں سرگوشی کریں گے۔ "وہ الو جا رہا ہے"

"آرڈر! آرڈر۔" چچا عبدالباقی نے اپنے چشمے کو اتار کر سامنے میز پر ہلکے سے مارتے ہوئے کہا۔ تم ایک کافی طویل تقریر کر چکے ہو اور مجھے افسوس ہے کہ میں اس سے زیادہ وقت تمہیں نہیں دے سکتا۔ ہمیں ابھی کئی اور اہم فیصلے کرنے ہیں۔ اب رائے شماری ہو گی۔ تجویز کے حق میں کون ہے؟"

"AYE-" میں چلایا۔

"AYE-AYE" چچا عبدالباقی چلایا۔ "یہ تجویز دو موافق رایوں سے پاس ہو گئی ہے کہ تم ماہنامہ "الو" کے ایڈیٹر اور پبلشرز ہو گے۔" "بہتر۔" میں اپنا سبز فیلٹ لہراتے ہوئے چلاتا۔

"ان اہم امور کا تصفیہ ہو جانے کے بعد ہمارا کام تقریباً آدھا ختم ہو گیا ہے۔" چچا عبدالباقی نے کہا۔ "اب میرا خیال ہے اجلاس کو چائے کے لیے دس منٹ کے لیے ملتوی کیا جائے۔"

"بہت حسین خیال ہے۔"

چائے کے بعد (جس میں چینی کی بجائے بتاشے استعمال کیے گئے) اجلاس پھر شروع ہوا۔ اس دفعہ چچا عبدالباقی کے ہاتھ "شاہین" کا تازہ پرچہ تھا اور وہ نہایت سنجیدگی سے اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

"بختیار! میں دیکھتا ہوں" اس نے کہا "کہ ایڈیٹر کے علاوہ ایک ادارہ بھی ہوتا ہے۔ اس نمبر میں تین چار مضامین ادارے کے لکھے ہوئے ہیں۔ پچھلا عملی تبصرہ بھی ادارے کا ہے اور اندر ادارے کی ایک غزل بھی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ ہمیں ادارے کی

ضرورت پڑے گی؟''

میں نے جواب دیا ''ادارہ بے حد ضروری ہے۔ ادارے کے بغیر پرچہ کیسے مرتب ہوسکتا ہے؟ ''ابتدائیہ'' اور ''جہاں نما'' کون لکھے گا؟ آخر میں ادبی اور فلمی تبصرے وغیرہ کون کرے گا؟ ادارہ بے حد ضروری ہے۔''

''تو تم ادارہ بھی بن سکتے ہو۔'' عبدالباقی نے کہا۔

''مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ پبلشر' ایڈیٹر کے ساتھ اگر ادارہ بھی میں ہوجاؤں تو کیا ہرج ہے۔ لیکن تم خود جانتے ہو' میں کوئی ادبی آدمی نہیں۔ ادارہ تو میں بننے کو تیار ہوں مگر ''ابتدائیہ'' اور ''جہاں نما'' خود لکھ کر دینا ہوں گے۔''

چچا عبدالباقی نے میری ڈھارس بندھائی۔

''ارے بختیار! ابتدائیہ لکھنا بھی کوئی مشکل بات ہے۔ ہر ایک ادبی ماہنامہ تمہارے سامنے ہوگا۔ اس قسم کی عبارت لکھنا کیا مشکل ہے۔'' قارئین! خدا خدا کر کے ہمارے ''الو'' کا تیسرا شمارہ آپ کے پیش خدمت ہے۔ اس کے شائع کرنے میں ہمیں جن جن دقتوں سے گزرنا پڑا ہے اور جیسے نامساعد حالات کا سامنا کرنا پڑا ہے اس کے ذکر نا گوار سے ہم آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ اول کاتب حضرات تنگ کرتے رہے اور وعدوں پر ٹالتے رہے۔ جب کتابت ہو چکی تو پتہ چلا کہ کاغذ بازار میں نایاب ہو چکا ہے اور پریس والوں نے ماتم میں ایک مہینے کے لیے پریس کا کام بند کر دیا'' چچا نے اپنے ہاتھ سے ''شاہیں'' پڑھتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ بھی نہ لکھ سکو گے۔ اچھا' اب ہماری پالیسی کیا ہوگی؟''

''پالیسی۔۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟''

''یعنی آیا کہ یہ حکومت کے خلاف ہوگا یا اس کے حق میں؟''

''نہیں' ادب کو حکومت یا اس کے حق میں ہونے سے کیا سروکار۔'' عبدالباقی جھلا کر بولا۔ ''ادبی ماہناموں کی تین پالیسیاں ہوسکتی ہیں۔ یا تو وہ ترقی پسند ہوسکتے ہیں یا رجعت پسند یا اسلامی ادب کے علمبردار۔ ہمیں ان تین میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔''

''رجعت پسند پالیسی ٹھیک رہے گی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ محفوظ پالیسی ہے۔ ترقی پسند حکومت کے مورد عتاب ہوتے ہیں اور اسلامی ادب والوں کو تو بات ہی چھوڑو۔''

چچا عبدالباقی نے کچھ غور اور فکر کے بعد کہا۔ ''الو'' کی پالیسی ایسی ہونی چاہیے کہ ترقی پسند اسے ترقی پسند سمجھیں' رجعت پسند یا حکومت پسند اسے رجعت پسند اور اسلامی ادب والے اسے اسلامی ادب کا علمبردار سمجھیں۔ ایک آدھ مضمون حقوق الزوجین کی قسم کا

دیا جاسکتا ہے۔ ''الو'' کو غیر جانبدار ہونا چاہیے۔''

''الو کو غیر جانبدار ہونا چاہیے۔'' میں نے تائید کی۔

''ہمارے پرچے میں جدت ہونی چاہیے۔ ہر ایک فکر اور سکول کے آدمی کے لیے اس میں کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔ ہم ایسی چیزیں چھاپیں گے جو لوگوں کو چونکا دیں۔ دھپ سے سیدھی ان کے دماغ پر جالگیں۔''

''ان کے دماغ پر جالگیں۔'' میں نے اتفاق کیا۔

''ہاں بھئی بختیار۔ ایک اور بات یاد آ گئی۔ ہمارے اغراض و مقاصد کیا ہوں گے؟ یہ سچ ہے کہ بعض ادبی ماہناموں کے اغراض و مقاصد نہیں ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ''الو بھی ان سے محروم ہو۔ ذرا وہ فرش پر سے پنسل اور کاپی اٹھا کر ہمارے اغراض و مقاصد لکھ لو۔ میں تمہیں لکھواتا جاتا ہوں۔''

میں نے ننھے عبدالرحمن کی کاپی پر اس کے اسکول کے کام کے آگے لکھنا شروع کیا۔

اغراض و مقاصد

''لکھو۔ نمبر ایک۔'' چچا عبدالباقی نے ''شاہین'' کے پچھلے اغراض و مقاصد کے صفحے سے الہام حاصل کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بھئی لکھ لیا۔ نمبر ایک۔''

''نمبر ایک''

''ماہنامہ ''الو'' باقاعدگی سے ہر ماہ کی آخری تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔''

''آخری!''

''شاہین'' ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ ''الو'' میں کچھ جدت ہونی چاہیے۔

نمبر دو، لکھو، نمبر دو!''

''مضمون نگار حضرات کے لیے اپنے مضامین کے ساتھ ڈیڑھ روپے کے ڈاک کے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہیں ورنہ وہ ہمیں ان مضامین کی اشاعت سے معذور سمجھیں۔

نمبر تین: مضامین کی اشاعت کا فیصلہ ایڈیٹر خود کرے گا اور اس کے فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہ ہوگی۔ اسے یہ بھی اختیار حاصل ہوگا کہ مضامین میں ضروری تصرفات اور اصلاح کر سکے اور مضمون نگاروں کے نام کی بجائے اپنے یا ادارے کے نام سے مضامین کو شائع

کردے۔ نمبر چار۔ ''الو'' کا مقصد علم وادب کی خدمت ہے اور یہ واحد پرچہ ہے جو بیک وقت ترقی پسند رجعت پسند اور اسلامی ادب کا نمائندہ ہے۔ نمبر پانچ۔ خط وکتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ بالکل نہ دیں ورنہ جواب نہیں دیا سکتا۔''

''اغراض ومقاصد'' پر چچا عبدالباقی اور مجھ میں کافی بحث ہوتی رہی اور آخر ہم انہیں آخری شکل دینے میں کامیاب ہو گئے۔

دوسرے دن صبح میں نے اپنے والد بزرگوار کو ایک نہایت محبت بھرا خط لکھا جس میں قبلہ گاہی کی اس ناچیز پر پہلے احسانات اور مشفقات کا شمار اور اعتراف کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ مجھے چھ سو روپیہ فی الفور بھجوانے کا انتظام کیا جائے اور یہ کہ اس دفعہ میں جو قدم اٹھا رہا ہوں وہ سمجھ بوجھ سے اٹھا رہا ہوں اور کامیابی اس قدر یقینی ہے کہ میں اسے ابھی سے اپنے کوٹ کی جیب میں ٹٹول کر محسوس کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے دو تین دوستوں کو بھی خط لکھے کہ اب وقت آ گیا ہے جب وہ میری حسب توفیق مالی امداد کر کے اپنی دوستی کی آزمائش میں پورے اتر سکتے ہیں۔

دس بجے کے قریب چچا عبدالباقی بھی مجسم زندہ دلی بنا آ پہنچا۔ ماہنامے کے بارے میں جو پہلی چیز ہمیں کرنی تھی وہ اس کا اجازت نامہ حاصل کرنا تھا۔ چچا اور میں وکٹوریہ میں بیٹھ کر انگل روڈ کے پیچھے کراچی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی کچہری میں پہنچے (وکٹوریہ کا کرایہ میں نے دیا)۔

ہم اوپر ایک کلرک کے پاس گئے۔

''آپ کے رسالے کا نام کیا ہے؟'' کلرک نے پوچھا۔

''الو۔'' میں نے کہا۔

''کیا آپ کا مطلب مجھ سے ہے؟'' کلرک کی کنپٹیاں لال ہو گئیں اور اس کے نتھنے پھول سے گئے۔

''نہیں، یہ ماہنامے کا نام ہے۔'' چچا نے وقت پر بیچ بچاؤ کر دیا۔

کلرک کو اس کو نگلنے میں کچھ وقت لگا۔ پہلے اس نے سمجھا کہ ہم اس سے مذاق کر رہے ہیں۔ مگر چچا عبدالباقی نے اسے واقعی یقین دلایا کہ ہمارے ماہنامے کا نام ہی الو ہے تو اس نے اپنے رجسٹر میں جاری شدہ رسائل اور ماہناموں کی فہرست کا جائزہ لیے بغیر ہمیں دو فارم دے دیے۔ میں نے چچا کی ہدایت کے مطابق خانہ پری کی اور اس کے بعد ہم ایک چٹ بھیجنے پر مجسٹریٹ کے روبرو بلائے گئے۔ وہ ہنستی ہوئی آنکھوں والا ایک سیاہ خوش طبع آدمی تھا جس کے دانت بہت نمایاں تھے۔ اس نے ہمیں سامنے دو کرسیوں کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''تو آپ کا اردو کا ماہنامہ نکالنا چاہتے ہیں۔'' اس نے مجھے قدرتاً نظر انداز کرتے ہوئے اور چچا عبدالباقی کی پروقار اور مرعوب کن شخصیت سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ آپ کے رسالے کا نام کیا ہے؟''

''الو'' چچا نے جواب دیا۔

''کیا آپ یہ مجھے فرما رہے ہیں؟'' مجسٹریٹ نے کہا۔ خوشگوار مسکراہٹ اس کے چہرے سے غائب ہوگئی۔

''ماہنامے کا نام ہے' صاحب!'' چچا نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

''عجیب نام ہے۔'' مجسٹریٹ نے قدرے شک کی نظر سے میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ صاحبان کو اس سے بہتر نام نہیں سوجھا؟''

مجسٹریٹ کے سوال نے چچا کو اپنی وہی وجوہ دہرانے کا موقع دیا جنہیں وہ پہلے مجھے بتا چکا تھا۔ اس نے ان مختلف رسائل اور جرائد کے نام گنائے جن کے نام پرندوں کے نام پر تھے۔ اس نے مجسٹریٹ پر اس افسوسناک امر کی وضاحت کی کہ کیسے ''الو'' کو اب تک نہ صرف نظر انداز بلکہ غیر منصفانہ طریق پر مطعون بھی کیا جاتا رہا ہے۔

پھر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ہم سے پوچھا کہ آپ کو ادبی رسائل چلانے کا پہلے کچھ تجربہ ہے اور چچا عبدالباقی نے کہا کہ وہ ایک کتاب ''روپیہ کمانے کے ایک ہزار طریقے'' عرف'' کیا آپ نکھٹو ہیں؟'' کا مصنف ہے اور تین چار ایڈیٹروں سے اس کے ذاتی تعلقات ہیں۔ (یہاں اس نے ان ایڈیٹروں کے نام لیے جو اس کے مضامین کو واپس کر چکے تھے) میں نے کہا کہ میں اپنی کالج میگزین ''بدر کامل'' کا نائب مدیر رہ چکا ہوں۔ مجسٹریٹ نے ہمیں یقیناً باولوں کا ایک جوڑا سمجھا ہوگا مگر اس نے غالباً یہ سمجھ کر کہ ''الو'' نام کا رسالہ کسی صورت میں بھی حکومت کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ اور منقار' اور اگالدان کی قسم کا ایک ہلکا مزاحیہ پرچہ ہوگا ہمیں اجازت نامہ دے دیا۔

دوسرے ہی دن میرے احتجاج کے باوجود چچا عبدالباقی نے میرے فلیٹ کے دروازے پر مسٹر بختیار خلجی' مدیر ماہنامہ ''الو'' کا بورڈ لگوا دیا۔ اس کے دام میں نے دیے شام تک ''الو'' کے کاغذ وغیرہ بھی چھپ کر آ گئے اور جاتے وقت چچا عبدالباقی مجھے ایجنٹوں اور مصنفوں کو خطوط لکھنے کے بارے میں ہدایات بھی دے گئے۔

''پہلے شمارے کے لیے تو ہمیں مضامین کی خاص ضرورت نہیں'' اس نے اپنے پانچ چھ مضامین کے مسودے میرے حوالے کرتے ہوئے کہا جو مختلف رسالوں کے ایڈیٹروں سے واپس آ چکے تھے اور جن میں سے اکثر اس کے کالج کے زمانے کے تحریر شدہ

تھے۔ ''ہم دونوں مل کر پہلے شمارے کے لیے مضامین پورے کر سکتے ہیں۔''

چچا عبدالباقی نے خود سرورق کا خاکہ بنایا۔ اس پر ایک بڑے الو کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس کے اوپر یہ شعر تھا:

ہما کو چغد کب پہچانتا ہے کہ قدر الو کی الو جانتا ہے۔

اور اس کے بعد آرٹسٹ کو بھیج دیا گیا۔ اس عرصے میں والد بزرگوار نے مجھے چھ سو روپے کا ایک چیک بھجوایا اور خط میں تنبیہ کر دی کہ اس کے بعد ان سے اک پائی کی بھی توقع بھی نہ رکھوں۔ دو تین دوستوں نے بھی اپنی دوستی کی لاج رکھنے کی خاطر حسب توفیق مجھے منی آرڈر بھیجے۔ چچا کے کہنے کے مطابق فوراً اس رقم کا کاغذ خرید کر سٹاک کر لیا گیا' کیونکہ کاغذ کا بھاؤ روز بروز چڑھتا جا رہا تھا۔ اور چچا کا خیال تھا کہ ایک مہینے تک کاغذ کا دستیاب ہونا ہی ناممکن ہو جائے گا۔

میرے یہ دن بڑی مصروفیت میں گزرے۔ میں نے ایجنٹوں کو لاتعداد خط لکھے۔ (صرف سو روپے کے ڈاک کے ٹکٹ ہی ان پر لگے) کہ ہم ماہنامہ ''الو'' کا اجراء کر رہے ہیں اور وہ ہمیں اپنی ضرورت کی کاپیوں کے لیے آرڈر دیں۔ میں نے مختلف رسائل میں سے ادبی لوگوں کے نام نقل کیے۔ بڑی دقتوں سے ان کے پتے دریافت کیے اور ان سے خطوط کے ذریعے درخواست کی کہ وہ ''الو'' کے صفحات کو اپنی نگارشات عالیہ سے مزین کریں۔ ان کو یقین دلایا گیا کہ ''الو'' کا پہلا شمارہ مفت ان کی خدمت میں پیش کیا جائے گا دو سو ایجنٹ حضرات میں سے جن کو میں نے لکھا تھا صرف ایک جواب آیا کہ:

''تسلیم! آپ کا خط پہنچا۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ فی الجملہ صرف پانچ عدد الو بھجوا دیجئے۔ آج کل خالص علمی و ادبی پرچوں کے لیے فضا سازگار نہیں ہے۔ بہتر ہوگا اگر آپ اسے فلمی رسالہ بنا دیں۔ ہم آپ سے انشاء اللہ پورا تعاون کریں گے۔ امید ہے آپ یہ پہلے پانچ ''الو'' ہمیں مفت نمونہ ارسال کریں گے۔ فقط

فقط۔۔۔۔۔۔۔ سید سخاوت حسن بک سیلرز' پنڈی بہاء الدین

مصنفوں میں سے کسی نے خط کی رسید تک نہ دی حالانکہ ان کو جوابی خط کے لیے ٹکٹ بھی بھیجے گئے تھے۔ چچا عبدالباقی نے اشتہارات کی فراہمی کے سلسلے میں کچھ دوڑ دھوپ بھی کی اور چار پانچ مفت اشتہار فراہم کر لیے۔

میں نے بصد وقت ادبی رسالوں کے بہترین نمونوں کو سامنے رکھ کر ابتدائیہ اور جہاں نما اور فلمی تبصرہ وغیرہ وغیرہ فلم بند کیے۔ مجھے لکھنے کا فن نہیں آتا اور اس ادبی کوشش سے میرے سر میں تین چار دن سخت درد رہا اور جگر وغیرہ نے اپنا فعل چھوڑ دیا۔ جب میں نے انہیں چچا عبدالباقی کو دکھایا تو اس نے اپنے بڑے سر کو ''نہ'' میں ہلایا اور پھر بیٹھی بیٹھے دس منٹ میں ان کو از سر نو لکھ مارا۔ یہ غالباً اپنی

طرز کی ادبی شاہکار چیزیں تھیں۔ میں ان کو ہو بہو یہاں نقل کر دیتا مگر افسوس ہے کہ وہ اب کھوئی جا چکی ہیں۔

مہینے کے اخیر تک میرے پاس ''الو'' کے لیے مندرجہ ذیل مضامین فراہم ہو چکے تھے:

ابتدائیہ۔۔۔۔۔۔۔ادارہ

جہاں نما۔۔۔۔۔۔۔ادارہ

کیا آپ دولت کمانا چاہتے ہیں؟۔۔۔۔۔۔۔پروفیسر عبدالباقی

زیبروں کے پکڑنے کے طریقے۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر عبدالباقی

عشق مجازی اور حقیقی میں فرق۔۔۔۔۔۔۔حاجی عبدالباقی بی اے ایل ایل بی

غزل۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔استاد عبدالباقی باقی جھنگ مگھیانوی

ڈاچی والا۔عشقیہ رومان۔۔۔۔۔۔۔عبدالباقی

''مضامین کافی فراہم ہو چکے ہیں۔'' چچا عبدالباقی نے کہا۔ ''اب بھئی بختیار ان کو کتابت کے لیے دے دو اور ہاں پہلے شمارہ میں ہمارے فوٹو ہونا بھی لازمی ہیں۔ اس کے لیے پہلے فوٹو کھنچوانا پڑے گا۔ پھر اس کا بلاک بنوانا پڑے گا۔''

اس سے مجھے اور چچا کو فوٹو کھنچوانے کا موقع مل گیا۔ ہم نے ایک مدت سے اپنے فوٹو نہیں کھنچوائے تھے۔ ہم نے کفایت شعاری کو مدنظر رکھتے ہوئے بولٹن مارکیٹ کے ایک آٹھ منٹ میں فوٹو تیار کر دینے والے فوٹو گرافر سے فوٹو کھنچوائے۔ یہ فوٹو تیار ہونے کے بعد ہماری بجائے کسی اور کے معلوم ہوتے تھے اور پس پردہ میں ہوائی جہاز کافی بیہودہ لگتا تھا۔ چچا نے ان کو پھاڑ دیا اور آخر چچا نے تجویز پیش کی کہ تصویریں گھر پر کھنچوائی جائیں۔ یہ تصویریں چچا عبدالباقی کے گھر پر میرے خرچ سے کھینچی گئیں اور اپنی تصویر میں چچا نے اپنے گھر کے افراد کو بھی شامل کر لیا۔ میری تصویر میں چچا اپنے بیٹے عبدالرحمن کو میری گود میں بٹھانا چاہتا تھا مگر میں نے انکار کر کے پہلی بار اپنے کردار کی پختگی کا ثبوت دیا۔

''الو'' آخر کار کتابت کے لیے ایک کاتب کو دے دیا گیا جو راجہ مینشن میں ایک چھوٹے کمرے میں کام کرتا تھا رہتا وہ کہیں اور تھا۔ وہ ایک سفید داڑھی والا معمر شخص تھا جسے غالباً آشوب چشم کی قسم کا کوئی مرض تھا۔ بحیثیت ''الو'' کے ایڈیٹر کے مجھے ہر دوسرے تیسرے روز اس کے پاس کچھ خوشامد کرنے اور کام کی رفتار دیکھنے کے لیے جانا پڑتا۔ جب میں اس کے کمرے میں اس کے بالکل سامنے جا کھڑا ہوتا تو وہ اپنی مسند پر سے مجھے بالکل کوری آنکھوں سے دیکھتا اور جب میں السلام علیکم کہہ کر بصد ادب اس کے پاس دو

زانو ہو کر فرش پر بیٹھ جاتا تو بھی اس کی آنکھوں میں شناخت کی کوئی علامت ظاہر نہ ہوتی۔ اس کا آشوب چشم کافی ترقی پذیر تھا۔

''سنایئے حافظ صاحب!'' میں پوچھتا''۔ کہاں تک کتابت کر لی؟''

''آپ۔۔۔۔۔۔ آپ اگالدان والے ہیں یا فلمی پری والے

''میں میں ''الو'' والا ہوں۔''

''اخاہ! تو بس صاحب آپ کا کام ہو رہا ہے۔ یہ صفحہ ختم کر کے میں آپ ہی کا کام شروع کرنے والا تھا۔ ایک عرض ہے کہ بچوں کو آج کل بخار اور زکام کام کی شکایت ہے۔ دوادارو کے لیے کچھ خرچ کی ضرورت ہے۔ کچھ پیشگی دلوا دیجیے۔''

میں نے اس کے ہاں درجنوں ہی چکر کاٹے۔ اتنے چکر کہ میرے بوٹوں کے تلوے واقعی گھس گئے۔ ہماری ملاقات کی ابتدا ہمیشہ انہی فقروں سے ہوتی تھی جو میں نے اوپر درج کیے ہیں۔ اگر میں اسے یہ بتاتا کہ میں اگالدان' یا فلمی پری' والا ہوں تو وہ مجھے اگالدان'' والا ''اور فلمی پری'' والا سمجھ لیتا۔ مجھے تعجب تھا کہ وہ مسودوں کے حروف کیسے پڑھ لیتا ہے۔ بے شمار وعدوں کے بعد اس نے پندرہ روز میں فہرست مضامین' ابتدائیہ اور جہاں نما کی کتابت مکمل کر لی اور مجھے کاپی حوالے کی کہ جا کر اسے دیکھوں اور پھر اسے تصحیح کے لیے واپس لا دوں گھر آ کر میں نے کاپی دیکھی تو فہرس مضامین پڑھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یہ فہرس ''الو'' کے مضامین کی فہرست سے بالکل مختلف تھی۔ میں نے پڑھا:

اسلام میں نظریہ اجتماعیت۔۔۔۔۔۔۔مولانا شہبازی

اسلامی حکومت میں حقوق الزوجین۔۔۔۔۔۔۔سید اشفاق علی کشفی نقشبندی

فتاویٰ۔۔۔۔۔۔۔احمد اسماعیل

حضرت جہاں گرد جہانیاں رحمتہ اللہ علیہ۔۔۔۔۔۔۔شاہ گیلانی جہاں گردی

تائید ایزدی کے فوائد۔۔۔۔۔۔۔مولوی بلیغ سہاردی

جبریل نامہ۔۔۔۔۔۔۔ابو اصلاح۔۔۔۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ

میرا سر چکرا گیا۔ کاتب نے مجھے غلطی سے ''الو'' کی بجائے رسالہ ''مفتاح السلام'' کی کاپی دے دی تھی۔

میں ہراساں بھاگا بھاگا پھر کاتب اس کے فلیٹ پر پہنچا۔ ایک مسجع مقطع شخص جس کے بالائی لب منڈے ہوئے تھے اور جس کی ڈاڑھی کے پیٹ تک آتی تھی دروازے کے باہر نہایت غصے کی حالت میں کھڑا بار بار لاحول پڑھ رہا تھا۔ وہ خود سراپا لاحول کی تصویر

لگتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک زرد کاپی تھی۔

''کیوں صاحب! آپ کو معلوم ہے۔ یہ کاتب صاحب کہاں چلے گئے ہیں؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''میں خود ان کے لیے آیا ہوں۔''

''عجب نامعقول آدمی ہے۔'' اس نے کاپی کو میرے سامنے ہلاتے ہوئے کہا ''مجھے غلطی سے اس نے ''مفتاح الاسلام'' کی کاپی کی بجائے اس بیہودگی کے پلندے کی کاپی دے دی ہے۔ مجھے گھر جا کر پتہ چلا۔ لاحول ولاقوۃ۔''

میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ کاپی جسے وہ بیہودگی کا پلندہ کہہ رہا تھا یقیناً ''الو'' کی کاپی تھی۔

میں نے کہا۔ ''یہ دیکھیے مولانا۔ یہ تو آپ والی نہیں؟ ہماری کاپیاں غالباً تبدیل ہوگئی ہیں۔ آپ کے رسالے کی کاپی کاتب نے مجھے دے دی ہے۔'' میں نے مفتاح الاسلام کی کاپی اس کے ہاتھ میں دینے اور اس سے ''الو'' کی کاپی لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''مولانا'' ''الو'' مجھے دے دیجیے۔''

''الو ہوں گے آپ۔'' مولانا نے غضبناک ہو کر تنتے ہوئے کہا۔

''مولانا' منہ سنبھال کر بات کرو۔'' میں نے ایک محفوظ فاصلے پر جا کر اس غضبناک شخص کو تنبیہہ کی۔ ''الو' اس ماہنامے کا نام ہے جس کی کاپی آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

اس نے مجھے کچھ شک آمیز اور قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر مجھ سے اپنی مفتاح الاسلام' کی کاپی لے لی اور ''الو'' کی کاپی مجھے دے دی۔ میں نے کاپی کو کھول کر دیکھا۔ اس دفعہ یہ واقعی ''الو'' کی کاپی تھی۔ اگرچہ کاتب نے ''الو'' کو آلو بنا دیا تھا۔ غالباً اسے ایک زراعتی رسالہ سمجھتے ہوئے کاتب نے خود ہی تصحیح کر دی تھی۔ فہرس مضامین میں جہاں نما' جہاں لمبا' پڑھا جاتا تھا۔ اور ادارہ' دارا' (غالباً سکندر والا دارا) عبدالباقی ایک جگہ عبدالساقی بن گیا تھا۔ اور عشق مجازی' عشق تازی' ہو گیا تھا۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی گلریزیاں دیکھی جا سکتی تھیں۔

گھر آ کر جب میں نے کاپی کو اچھی طرح دیکھا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کاتب کی گلریزیاں رات بھر میرے سینے پر لوٹتی رہیں۔ کم بخت میں معمولی سوجھ تک نہ تھی۔ ساری کاپی جا بجا اغلاط سے پٹی ہوئی تھی۔ دوسرے دن میں سخت غصے میں اس کے فلیٹ پر گیا۔ اب کے بھی کمرے میں قفل پڑا ہوا تھا۔ میں تین گھنٹے تک وہاں انتظار کرتا رہا۔ ایک شخص سے مجھے کاتب کے مکان کا پتا معلوم ہوا اور بڑی دقت سے اس کے مکان کا کھوج لگانے میں کامیاب ہوا جو سولجر بازار میں ایک تنگ گلی میں تھا۔ میں نے غصے میں

اپنی مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں اور تہیہ کر رکھا تھا کہ اب کے میں اس سے اس کی ذات کے بارے میں ناگوار باتیں کہوں (گا اور جوں ہی وہ دروازے سے نکلے گا اس کو نشانہ بنا کر اس پر مکے بازی کی مشق شروع کر دوں گا۔ ایک مرکھنے بیل کی طرح اس پر چڑھ دوڑوں گا۔

کنڈی کھٹکھٹانے پر ایک چھوٹا سا لڑکا باہر آیا۔

''کاتب امام دین صاحب ہیں؟''

''نہیں جی! بچے نے اوپر ایک پتنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔'' وہ آج صبح ملتان بھینس خریدنے چلے گئے ہیں۔''

''کب آئیں گے؟'' میں نے صبر کے گھونٹ پیتے ہوئے پوچھا۔

'' کچھ کہہ کر نہیں گئے۔ وہ کاٹا' وہ کاٹا!''

''ہمارا ''الو'' رسالہ ان کے پاس کتابت کے لیے بڑی دیر کا پڑا ہے۔ ان کا ملتان کا پتا اندر سے پوچھ کر بتاؤ۔''

مگر جب لڑکے نے بتایا کہ کاتب صاحب کا بھینس خریدنے کے بعد گوجرانوالہ میں دوسری خانہ آبادی کرنے کا پروگرام تھا تو میں نے ہمت ہار دی۔

چچا عبدالباقی نے مجھے کوسا۔ اسے مجھ سے ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ مجھ میں تنظیم کا مادہ نہیں ہے۔ حالانکہ کاتب کا انتخاب اس نے خود کیا تھا۔ میں کچھ عرصے روز کاتب کے مکان پر جاتا رہا مگر اب میرے کھٹکھٹانے پر کوئی باہر نہ آتا تھا۔ ایک دفعہ اس کے مکان کے سامنے ایک بھینس کو چرتے دیکھ کر مجھے امید بندھی کہ وہ لوٹ آیا ہے مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ بھینس کسی اور شخص کی تھی۔

ماہنامہ ''الو'' نہ نکل سکا۔ کاتب اپنے غائب ہونے کے کوئی تین مہینے بعد مجھے نظر پڑا۔ اس نے مجھے نہیں پہچانا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں ''الو'' والا ہوں اور وہی شخص ہوں جس سے وہ پچھتر روپیہ پیشگی لے کر ہضم کر چکا ہے تو اپنے حافظے پر زور دینے کے باوجود اسے کچھ یاد نہ آ سکا۔ بہرحال اس نے مجھے بتایا کہ اس نے کتابت کا پیشہ ترک کر دیا ہے اور پیر الٰہی بخش کالونی میں پان بیڑی کی دکان کھول لی ہے۔ چچا عبدالباقی نے حسب معمول اس وقت تک ''الو'' میں اپنی دلچسپی تقریباً کھو دی تھی۔ ایک اور سکیم اس کے دماغ پر حاوی ہو گئی تھی۔ دن اور رات وہ زیبروں کی باتیں کرتا تھا۔

''زیبرے'' وہ مجھے کہتا'' زیبروں کے کاروبار میں بڑا روپیہ ہے۔ اگر ایک ہزار روپیہ فی زیبرا بھی ہم بیچیں تو وہ پنسل اور کاپی اٹھا لو اور ذرا حساب کر دو۔''

◆◆◆

زیبرا اسکیم

زیبروں کی درآمد کرنے کا انوکھا خیال چچا عبدالباقی کے ذہن میں پہلے پہل غالباً اس اتوار کو آیا جب ہم چچا عبدالباقی' اس کا سات سالہ لڑکا عبدالرحمن اور میں چڑیا گھر میں جانوروں کا معائنہ کرنے گئے۔ معائنہ کا لفظ میں نے قصداً استعمال کیا ہے۔ کیونکہ جس طریق سے چچا جانوروں کو غور اور سنجیدگی سے دیکھتا ہے۔ اس کے لیے معائنہ کا لفظ ہی مناسب ہے۔

میں نے غالباً پہلے بھی کہیں عبدالرحمن کا ذکر کیا ہے۔ وہ نکلے ہوئے کانوں والا ایک شوخ لڑکا ہے۔ جسے اپنے بڑوں کا ذرا بھر بھی پاس ادب نہیں۔ ایسے بچوں کی ہی وجہ سے بزرگ حضرات کو قیامت کے قرب کا احساس ہو چلا ہے۔ ان دنوں میں کچھ روز کے لیے چچا کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اور ایک طریق سے اس عبدالرحمن کی اتالیقی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اپنے اس شاگرد کی مستقل صحبت چند دنوں سے میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ عبدالرحمن میرا حد درجہ مشتاق ہو رہا تھا۔ پل بھر کے لیے مجھے تنہا نہ چھوڑتا اور میں سرد آہیں بھر کر اکثر اس بات پر تعجب کرتا کہ بعض انسان دوسرے انسانوں کے اس قدر مشتاق کیونکر ہو جاتے ہیں۔ چچا کے مکان پر ابھی مجھے ایک ہفتہ ہی تو ہوا تھا اور اس عرصے میں عبدالرحمن مجھ سے میرا مفلر اور سگریٹ لائٹر بطور خود مانگے ہوئے تحفوں کے قبول کر چکا تھا۔ ایک دو روز سے وہ مجھے اس بات پر اکسانے میں لگا ہوا تھا کہ میں اپنی کلائی کی گھڑی بھی اسے نذر کر دوں۔ اس کا سکول کا کام بھی میں اسے کر کے دے رہا تھا۔ چچا عبدالباقی اپنے منہ بولے بھتیجے اور نوخیز ہونہار بیٹے کے درمیان اس قدر محبت اور دوستی کو دیکھ کر پھولا نہ سماتا تھا اور اگرچہ وہ جانتا تھا کہ یہ محبت اور دوستی یک طرفہ ہے پھر بھی وہ یہی ظاہر کرتا ہے جیسے میں عبدالرحمن پر جان چھڑکتا ہوں اور اس سے گہری وابستگی اور انس رکھتا ہوں۔

انہی دنوں ایک چمکیلی' سنہری اتوار کو چڑیا گھر کے جانور ہمیں دیکھ کر بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔ چچا عبدالباقی کے ہمراہ چڑیا گھر جانا ایک سعادت ہے۔ ہمارا جانوروں کے معائنہ کا طریق کار یہ تھا کہ ہم ایک جانور کے پنجرے کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے۔ چچا ہم سے ایک قدم آگے بالکل پنجرے کی سلاخوں کے ساتھ پہنچ کر رک جاتا اور عبدالرحمن اور میں اس کے پیچھے صف آراء ہو جاتے' چچا عبدالباقی چشمہ ناک پر ڈھلکائے ہاتھ میں بید کی سوٹی لئے اور مجسم متانت اور وقار کی تصویر بنا جانور کا معائنہ کرتے ہوئے مجھے اور عبدالرحمن کو اس جانور کی عادات و خصائل' طریق بود و باش' فلسفہ زندگی وغیرہ پر ایک مبسوط لیکچر دیتا۔ مجھے مختلف جانوروں کے متعلق

اس روز کئی قسم کی معلومات حاصل ہوئیں جو بہت عجیب وغریب تھیں۔ ایک جگہ چچا کا یہ معائنہ پورا کامیاب نہ رہا۔ بدقسمتی سے جانور نے موقع کی سنجیدگی اور اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا۔ ہوا یہ کہ چچا عبدالباقی برازیلی بندروں کے ایک جوڑے کے پنجرے کے ساتھ کھڑا ہوا میرے اور عبدالرحمن کے استفادے کی خاطر برازیلی بندروں کے سماجی اور معاشی پس منظر پر روشنی ڈال رہا تھا اور چچا کی تقریر سننے کے لیے کئی تماشائی ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے۔ خود برازیلی بندروں کا جوڑا چچا کی باتوں کو گہری توجہ اور دلچسپی سے سنتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس تقریر کے دوران میں چچا نے کسی مسئلہ پر زور دینے کے لیے اپنی سوٹی اٹھا کر بندروں کی طرف اشارہ کیا جس پر برازیلیوں میں سے ایک نہایت پھرتی اور صفائی سے سلاخوں سے پنجہ نکال کر سوٹی کو جھپٹ لیا۔ چچا کی تقریر لوگوں کے قہقہوں میں ختم ہو گئی۔ چچا نے ہمیں مڑ کر یقین دلایا کہ برازیلیوں نے یہ محض دل لگی کی ہے اور ان کا سوٹی چھین لینے کا کوئی ارادہ نہیں اور یہ کہ وہ اس سے تھوڑی دیر کھیلنے کے بعد اسے لوٹا دیں گے۔ برازیلیوں کے مزاح کی حس اور معقولیت کے بارے میں چچا کی خاص رائے تھی۔ ہم نے برازیلیوں کو کئی طریقوں سے سوٹی واپس کرنے پر اکسایا۔ عبدالرحمن نے انہیں دو تین مونگ پھلی کے پیکٹ پیش کئے مگر برازیلی اپنی مزاح کی حس کو بہت دور لے جانے پر تلے بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد چچا عبدالباقی نے برازیلیوں میں اپنا اعتماد کھو دیا۔ ان کے متعلق اپنی رائے تبدیل کر دی اور ان کو دھمکی دی کہ وہ چڑیا گھر کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا کر چڑیا گھر کے بعض جانوروں کے برے اخلاق کی شکایت کرے گا اور اس سے اپنے نقصان کے ہرجانے کا مطالبہ کرے گا۔ اس کی نوبت نہ آئی اور چڑیا گھر کے ایک ملازم نے آخر خود پنجرے کے اندر جا کر چچا کی سوٹی کو برازیلیوں سے رہائی دلوائی۔

چچا کے سکون طبع کو دوسرا دھچکا اس وقت لگا جب ہم شیر ببر کے پنجرے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ شیر ببر ایک معمر حیوان تھا اور سلاخوں کے پاس لیٹا ہوا ہمیں ایک بیزاری کے عالم میں تک رہا تھا۔ چچا سلاخوں سے آدھ فٹ کے فاصلے پر اپنی سوٹی کو زمین پر ٹیکے شیر ببر کا معائنہ کرنے لگے۔ وہ ہمیں شیر ببر کی جرات، اس کی وسعت قلبی اور اس کی خودی پر ایک تقریر کر رہا تھا اور ہم پر واضح کر رہا تھا کہ کس طرح ایک شیر ببر ایک عام شیر سے یعنی اس شیر سے جو ببر نہیں ہوتا ہر لحاظ سے ممتاز ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب وہ ہمیں بتا رہا تھا کہ شیر دریا میں سیدھا تیرتا ہے اور اگر وہ تیرتے ہوئے بہاؤ میں مڑ جائے تو پھر واپس کنارے پر آ کر دوبارہ تیرتا ہے، شیر ببر نے احتجاج کے طور پر اٹھ کر اپنے بڑے ایال دار سر کو جھنجھوڑا اور خوفناک طریق سے دھاڑا۔ چچا عبدالباقی اور ہم فوراً وہاں سے بھاگے اور زیبروں کے احاطہ کے پاس آ کر دم لیا۔

احاطے میں دو زیبرے زمرد یں گھاس پر ٹہل رہے تھے۔ وہ چاق و چوبند دھاری دار زیبرے بھوری خاکستری کھال پر چوڑی

سیاہ دھاریاں خوشنما معلوم ہو رہی تھیں اور چوپایوں کے خلاف اپنی جبلی مخاصمت کے باوجود میں انہیں دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ چچا عبدالباقی احاطے کی جالی کے ساتھ لٹکے ہوئے ایک لکڑی کے بورڈ کی طرف چلا گیا جسے چڑیا گھر کے منتظمین نے ان لوگوں کی خاطر لگوایا تھا۔ جو زیبروں میں کسی قسم کی دلچسپی لیتے تھے۔ اس پر انگریزی میں زیبروں کے متعلق ہر نوع کی معلومات بہم پہنچائی گئی تھیں۔ بورڈ کو بغور پڑھنے کے بعد چچا عبدالباقی ہماری طرف آیا اور اس نے عبدالرحمن اور مجھے فخر سے یہ اطلاع دی کہ احاطے میں وہ جو دو خچر نما جانور ہیں حقیقتاً زیبرے ہیں۔

اس نے ہمیں احاطے والے زیبروں کے گزشتہ سوانح کے بارے میں ایک لیکچر دیا۔ چچا عبدالباقی ان حیوانوں کے اجلے کوٹوں اور چست انداز سے بے حد متاثر معلوم ہوتا تھا اور اس کی رہنمائی میں ہم نے احاطے کی جالی دار چار دیواری کے گرد چار پانچ چکر لگائے۔ چچا ان چوپایوں کو ہر ممکن زاویے سے دیکھنا چاہتا تھا۔ عبدالرحمن بھی زیبروں کے متعلق کچھ جانتا تھا۔ کم از کم اس کا خیال تھا کہ وہ جانتا ہے۔ اس نے اپنی اردو کی کتاب میں زیبروں پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کے درمیان جو مجھے علم الحیوانات کے متعلق مکمل معلومات دینے پر مصر تھے میں نے اپنے آپ کو بے حد جاہل محسوس کیا۔ میں نے تہیہ کیا کہ چڑیا گھر سے جاتے ہی زیبروں پر ایک مکمل کتاب پڑھوں گا۔ اور اپنی معلومات عامہ کو وسیع کرنے کی کوشش کروں گا۔ چوپایوں کے بارے میں میری معلومات بہت کم ہیں اور جو کچھ میں ان کے بارے میں جانتا ہوں وہ ہر شخص جانتا ہے۔ مثلاً مجھے یقین ہے کہ بھینس گوشت نہیں کھاتی اور اونٹ درخت پر نہیں چڑھ سکتا۔ لیکن اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ دریائی گھوڑے کے تفریح مشاغل کیا ہوتے ہیں یا شیر کی معاشرتی اور پرائیویٹ زندگی کس نوعیت کی ہوتی ہے۔ تو میں بالکل کورا ثابت ہوں گا اور بجائے کوئی جواب دینے کے بغلیں جھانکنے لگوں گا۔

چچا عبدالباقی نے اپنا بازو میرے بازو میں دیتے ہوئے کہا۔ ''بھئی بختیار! یہ زیبرے اچھے خوبصورت جانور ہیں۔ اگر ان کی یہ دھاریاں نہ ہوں تو یہ خچروں اور گھوڑوں کی طرح مٹیالے اور غیر دلچسپ نظر آنے لگیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ان زیبروں کو وکٹوریہ یا تانگے کے آگے گھوڑوں کے بجائے جوتا جائے تو کیسا رہے۔ ذرا تصور کرو کہ کراچی کی وکٹوریوں کے آگے مریل بھورے گھوڑوں کی بجائے چست دھاری دار زیبرے جتے ہوئے ہیں۔ سنو بھئی بختیار کیوں نہ ایک زیبرا درآمد کمپنی کھولی جائے اور نائیجیریا سے زیبرے درآمد کیے جائیں اور وکٹوریہ والوں کو مہیا کئے جائیں۔ بڑا اچھا بزنس ہو سکتا ہے۔''

''زیبروں کو گاڑی کے لیے غالباً سدھایا جا سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ میں نے زیبروں کے متعلق یہ بات کہیں پڑھی تھی یا کسی

سے سنی تھی۔

''تم کو کس نے بتایا؟'' چچا عبدالباقی نے روک کر احتجاج کیا۔''لوگوں نے شیروں وغیرہ کو سدھا کر چھوٹے چھکڑوں میں جوت رکھا ہے۔ زیبرے تو پھر زیبرے ہیں۔ آؤ ہم زیبرے درآمد کریں گے اور بیچیں گے۔ میں خود ان کو سدھانے کا ذمہ لیتا ہوں۔ جب وکٹوریہ والوں کو پتا لگے گا کہ انہیں معقول داموں پر خوبصورت چتکبرے زیبرے دستیاب ہو سکتے ہیں تو وہ زیبروں پر ٹوٹ پڑیں گے۔

''مگر چچا! فائدہ کیا؟ گھوڑے کیا کریں گے؟ گھوڑے بیکار ہو جائیں گے۔''

''وقت آ رہا ہے جب گھوڑے بیکار ہو جائیں گے۔ بھتیجے بختیار خلجی! واللہ مجھے گھوڑوں کے خلاف کوئی بغض نہیں۔ مجھے ان سے ہمدردی ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا مستقبل تاریک ہے۔''

چڑیا گھر کے ایک ملازم کے بتانے پر کہ اب چڑیا گھر بند ہو رہا ہے اور پھر چار بجے شام کو کھلے گا' ہم نے زیبروں کو خیر باد کہا اور پھاٹک کی طرف بھاگے' زیبروں کی درآمد کی تجویز پر بحث پھاٹک تک ہوتی رہی اور جب وہاں سے گھر کے لیے دوہری چھت والی بس میں سوار ہوئے تو چھت کے اوپر بھی یہ بحث جاری رہی۔ چچا عبدالباقی کی واضح دلیلوں کے باوجود کہ زیبروں کی درآمد بے حد منافع بخش رہے گی' میں ابھی پوری طرح مطمئن نہ ہوا اور میرے شکوک کلی طور پر رفع نہ ہوئے تھے۔

چچا کے ڈرائنگ روم میں شکر کی چائے پیتے ہوئے ہماری گفتگو کا موضوع زیبرے تھے۔

''دیکھو بھئی! بختیار! میری بات سنو۔'' چچا نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''فرض کرو' ہم پہلے پہل سو زیبرے درآمد کریں اور ان کی پہلی افزائش نسل کا انتظام کریں۔ سال کے اخیر تک اگر ہمارے پاس پانچ سو زیبرے بھی ہوں' ممکن ہے ہزار ہوں یا دو ہزار۔ میں کم سے کم تخمینہ لگا رہا ہوں۔ ہاں اگر پانچ سو زیبرے بھی ہوں اور ہم ان کو پانچ سو روپیہ فی زیبرہ کے حساب سے بھی فروخت کریں تو پانچ سو روپیہ ضرب پانچ سو کتنے ہوئے؟ عبدالرحمن بھئی پانچ سو کو ذرا پانچ سو سے ضرب تو دو۔''

عبدالرحمن نے اپنی کاپی پر ضرب دے کر جواب بتایا۔''پانچ سو پچاس''

''پانچ سو پچاس روپے ہوئے۔ ہاں بھئی بختیار پانچ سو پچاس۔ مگر بھئی عبدالرحمن پانچ سو پچاس کیسے ہوئے؟''

''دو لاکھ پچاس ہزار بنتے ہیں۔'' میں نے زبانی ضرب دے کر بتایا۔ میری ریاضی عبدالرحمن سے قدرے بہتر ہے۔

''دو لاکھ پچاس ہزار روپیہ۔ چلو پچاس ہزار روپیہ چھوڑو۔ دو لاکھ ہمیں پھر بھی بچتے ہیں اور کتنی مدت میں' صرف ایک سال کی

مدت میں اور پھر ہمیں مزید زیبرے درآمد کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارے اپنے زیبرے بڑھتے رہیں گے۔"

"لیکن چچا وہ تو تم نے سال کے اخیر میں سب کے سب بیچ دیئے تھے۔"

"نہیں بھئی' سارے کہاں بیچے تھے اور پھر جن کو ہم زیبرے فروخت کریں گے ان کو اس شرط پر فروخت کریں گے کہ ان میں سے جو زیبرے پیدا ہوں گے وہ ہماری ملکیت ہوں گے۔ ہم ان لوگوں سے باقاعدہ معاہدے پر دستخط کرائیں گے۔"

مجھے ابھی تک اس سکیم کی کامیابی کے بارے میں شکوک تھے۔ میں نے ماہنامہ "الو" کے اجراء اور دوسری کئی سکیموں کے حسرت ناک انجام کے متعلق سوچا۔ ہم نے ان کو کس طمطراق کس خود اعتمادی سے شروع کیا تھا اور آخر ان کا حشر کیا ہوا۔ وہ تو پھر بھی کسی حد تک معقول سکیمیں تھیں۔ یہ زیبروں کی درآمد کی سکیم تو ایک بالکل بے معنی سکیم تھی۔

"دیکھو میرے بھتیجے بختیار" چچا نے میرے خیالات بھانپتے ہوئے کہا۔ "جب کوئی باہمت شخص نئی اور انوکھی چیز شروع کرتا ہے تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن ہمیں بے وقت لوگوں کے قہقہوں سے نہ ڈرنا چاہیے۔ جب میں نے مرغیوں کی فارمنگ کا آغاز کیا تو کئی میرے اپنے احباب مجھ پر ہنستے تھے اور کہتے تھے۔ "عبدالباقی شرط رہی کہ مہینے کے اندر اندر تم ان مرغیوں کو خود کھا جاؤ گے۔"

"اور چچا' تم واقعی کھا گئے؟"

"تمہیں کیسے پتا ہے؟"

"تم نے خود ہی ایک دفعہ بتایا تھا۔"

"بھئی بختیار! وہ اور بات ہو گئی تھی۔ ہم نے آغاز ایک سو مرغیوں سے کیا۔ انہی دنوں مجھے درد گردہ کی شکایت ہو گئی۔ ڈاکٹر نے خوراک یہ تجویز کی کہ ہر روز مرغ یخنی پیا کروں۔ پھر گھر میں روز چار چار مہمان آ کر رہنے لگے۔ وہ مجھ سے اپنے کاروبار کے سلسلے میں مشورے کرنا چاہتے تھے۔ مرغیوں کی فارمنگ شروع کرتے ہی میں احباب میں بے حد مقبول ہو گیا تھا اور وہ اکثر شام کو میرے غریب خانہ پر آ موجود ہوتے تھے۔ جب مرغیاں ختم ہو گئیں' میری مقبولیت فوراً گھٹ گئی۔ ہاں تو بھئی' بختیار' وہ مرغیاں زیادہ تر احباب کھا گئے۔ جو کچھ تھوڑی بہت بچ گئی تھیں انہیں بالاقساط پڑوسیوں کا ایک بلا پکڑ پکڑ کر کھاتا رہا۔ خیر یہ تو دوسرے قصے شروع ہو گئے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ زیبروں کا معاملہ دوسرا ہے۔ تم بھی اس پر سوچو اور میں بھی اس پر غور و فکر کرتا ہوں۔"

"چچا پہلے ہمیں یقین کر لینا چاہیے کہ آیا گھوڑے گاڑی والے زیبرے جوتنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟"

"آمادہ کیوں نہ ہوں گے۔ آخر انہیں کون سا نقصان ہے۔ یہی تو میں ذہن نشین کرانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پہلے پہل کوئی

بات کی جائے تو ہر کوئی ہنستا ہے۔ جب پہلے پہل ہنری فورڈ اپنی فیکٹری میں پہلی موٹر کار میں چڑھ کر باہر نکلا تو تمہیں پتا نہیں کہ دیکھنے والوں کے پیٹ میں ہنسی کے مارے بل پڑ پڑ گئے۔ زیبرے آ جائیں تو ان کو فروخت کرنے سے پہلے ہم ایک نمائشی زیبرا گاڑی رکھیں گے اور اس میں بیٹھ کر شام کو ہوا خوری کے لیے میکلوڈ روڈ اور الفنسٹن اسٹریٹ میں سے گزرا کریں گے۔ اس طرح لوگ زیبروں کو وکٹوریہ کے آگے جتا ہوا دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے اور رفتہ رفتہ یہ جدت جڑ پکڑنے لگے گی۔ یہ نمائشی گاڑی بڑی ضروری ہے۔ اب میں تمہیں ایک اور مثال دیتا ہوں۔ شروع شروع میں جب میں کراچی آیا تو لوگ میری ترکی ٹوپی پر تعجب کرتے اور ہنستے تھے۔ اس وقت یہاں بہت کم ترکی ٹوپی پہننے والے لوگ تھے۔ اب تم خود جانتے ہو ترکی ٹوپی کس قدر عام نظر آتی ہے۔ کل ہی کی بات ہے میں الفنسٹن اسٹریٹ میں سے گزر رہا تھا۔ سامنے سے چار اچھے بھلے پروقار شخص ترکی ٹوپیاں پہنے ایک قطار میں چلتے میرے پاس سے گزرے انہوں نے مجھے السلام علیکم کہا حالانکہ وہ مجھ سے واقف نہ تھے اور مجھ سے پیراڈائز سینما کا راستہ دریافت کیا۔ تو یہ بات ہوتی ہے۔ بھئی بختیار، پہلے زیبروں کے خلاف تعصب کو دور کرنا ہے۔ ایک دفعہ وہ تعصب دور ہو گیا تو زمین ہموار ہے اور گھوڑوں کے متعلق، میری اس بات کو پتھر پر لکیر سمجھ لو کہ گھوڑوں کا مستقبل قطعاً روشن نہیں، تاریک ہے۔"

"تمہاری رائے میں گھوڑوں کا اب کوئی چانس نہیں۔ انہیں میدان چھوڑ دینا چاہیے۔"

"زیبروں کے سامنے وہ نہیں ٹھہر سکتے۔ میرا ایمان ہے۔"

میرا اب بھی اطمینان نہ ہوا۔ مگر چچا عبدالباقی نے جمہوری اصول کے مطابق ووٹ لے کر جس میں زیبرا امپورٹ کمپنی ضرور قائم کی جائے گی، سرمائے کی فراہمی کا کام میرے ذمہ تھا اور باقی کاروبار کی شرائط تقریباً وہی تھیں جو پہلی سکیموں میں ہوتی تھیں۔ چچا عبدالباقی اس بزنس میں آدھے سے زیادہ کا حصے دار ہونے کا روادار نہ تھا۔ وہ بلا تنخواہ مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرنے پر تیار تھا۔ اگر میں چاہوں تو عبدالرحمن کو بھی ایک تیسرے شریک کی حیثیت سے لیا جا سکتا تھا مگر اس کا فیصلہ کلی طور پر میری دلی منشا پر چھوڑ دیا گیا۔

"سرمایہ اب کیسے حاصل کیا جائے؟" میں نے کہا۔ "میرے پاس تو صرف چار روپے آٹھ آنے ہیں اور میرا والد اب روپے کے معاملے میں سخت گیر ہو گیا ہے۔ انہیں میری سکیموں پر بالکل اعتماد نہیں ہے۔"

"ارے بھئی بختیار" چچا عبدالباقی بولا "لکھ کے دو دیکھو تین ہزار روپیہ شروع میں کافی ہوگا۔ میں نے سنا ہے اس بار ہڈیوں کا نرخ کافی چڑھا ہوا تھا اور انہوں نے ہڈیوں کے کاروبار میں کافی ہاتھ رنگے ہیں۔ آخر تم ان کے اکلوتے بیٹے اور جائز وارث ہو۔ ان کا

روپیہ تمہارے کام بھی تو آنا چاہیے۔ آخر کار تمہارے مستقبل کا سوال ہے۔ بھئی روپیہ کمانا چاہیے۔ اتنے تفکرات کے باوجود میں اب بھی جب صبح بستر سے اٹھتا ہوں تو اپنے آپ کو مخاطب کر کے گاتا ہوں۔

''او عبدالباقی دیکھ ایک اور نیا دن طلوع ہوا ہے۔ کیا تم اسے یونہی بے فائدہ گزر جانے دو گے؟''

''چچا میں بھی صبح اٹھ کر اپنے آپ کو یونہی الفاظ سے مخاطب کرتا ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''مجھ پر بھروسہ کرو'' چچا عبدالباقی بولا۔ ''زبیر ے ہماری مشکلات کو حل کریں گے۔''

جہاں تک اسکیم کا تعلق تھا زبیر اور درآمد کمپنی کی داغ بیل اسی شام چچا عبدالباقی کے ڈرائنگ میں پڑ گئی تھی۔ مگر سرمائے کے نہ ہونے کی وجہ سے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا جا سکا۔ دن گزرتے گئے اور اس عرصے میں میں چچا کے مکان سے کھارادر میں ایک فلیٹ میں ایک دوست کے پاس اٹھ آیا۔ جب بھی میں چچا سے ملتا تو ہماری گفتگو کا موضوع زبیر ے ہوتے۔ میں اپنے والد کو روپوں کے لیے لکھنے سے ہچکچاتا تھا کیونکہ میں ان سے اپنی کئی روپیہ کمانے والی سکیموں کے سلسلے میں اتنی مرتبہ روپیہ لے چکا تھا کہ اب ان کا متاثر ہونا محال نظر آتا تھا۔ اپنے پچھلے خط میں انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ مجھے ان سے اب کبھی ایک پائی بھی نہ ملے گی اور یہ کہ جہاں تک روپوں کا سوال تھا میں انہیں بھلا دوں تو بہتر ہے۔

آخر مجھے لکھنا پڑا۔ روپیہ حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ واضح الفاظ میں روپے کا مطالبہ کرنے کی بجائے میں نے ڈپلومیسی کا راستہ اختیار کیا۔ میں نے پہلے تو خط میں انہیں اس سال کے کاروبار میں خوب منافع کمانے پر مبارکباد دی اور اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ان پر یہ واضح کیا کہ میں نے یہاں ایک امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھول لیا ہے اور درآمد کا کام باقاعدہ شروع کر دیا ہے۔ میں نے زبیروں کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میرا خیال تھا بوڑھا آدمی میرے اشارے کو بھانپ جائے گا۔ مگر پہلے تو انہوں نے خط کا جواب ہی نہ دیا۔ دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ منافع کے متعلق میری اطلاعات نہایت غلط تھیں اور انہیں امسال کم از کم پچاس ہزار کا خسارہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ انہوں نے میرے درآمد کی کمپنی کھولنے پر خوشی کا اظہار کیا تھا اور پھر یہ نصیحت بھی کی تھی کہ سرمائے کی کمی سے نہ گھبرانا چاہیے اور یہ کہ جس وقت انہوں نے ہڈیوں کا دھندا شروع کیا تھا ان کی جیب میں کل ساڑھے پانچ آنے تھے' میں نے یہ خط چچا عبدالباقی کو دکھایا اور دیر تک ہم بوڑھے آدمی کی خودغرضی اور کوتاہ نظری پر اظہار افسوس کرتے رہے۔ اس خط کے دوسرے دن ہی مجھے والد صاحب کی طرف سے ایک تار موصول ہوا کہ فوراً آؤ۔ تمہاری شادی کی بات چیت ہو رہی ہے اور تمہارا ہونے والا خسر تمہیں دیکھنے کا خواہاں ہے۔

مجھے جانے میں قدرے تامل تھا۔ مجھے دیکھنے کے بعد پہلے کئی ہونے والے خسر اپنے ارادے تبدیل کر چکے تھے۔ جب میں نے یہ چچا عبدالباقی کو دکھایا تو اس نے فوراً جانے کا مشورہ دیا۔ اس نے مجھے کئی ایسے نیک دل خسروں کی مثالیں دیں جنہوں نے شادی کے وقت اپنے دامادوں کو تحفتاً پانچ ہزار یا اس سے زیادہ کے چیک عنایت کئے تھے۔ چچا عبدالباقی کی رائے میں یہ میرے لیے ایک سنہری موقع تھا۔ چچا خود مجھے گاڑی پر چڑھانے کے لیے اسٹیشن تک آیا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اگر وہ خود مجھے گاڑی پر سوار کرانے نہ آیا تو میں اپنا ارادہ بدل لوں گا۔ مجھے رخصت کرتے وقت اس نے مجھ سے ساڑھے چار روپے ٹیکسی کے لیے قرض لئے چونکہ وہ مجھے رسوا کرانے کے لیے آیا تھا اس لیے غالباً وہ یہ مناسب سمجھتا تھا کہ میں اس کو ٹیکسی میں واپس پہنچانے کا خرچہ برداشت کروں۔ اس دفعہ بھی وہ حسب معمول اپنے پیسے اپنے دوسرے کوٹ کی جیب میں بھول آیا تھا۔ وہ مجھ سے میری کلائی کی گھڑی بھی ادھار لینا چاہتا تھا مگر میں نے ادھر ادھر کی باتوں سے اسے اس بات کا موقع نہ دیا۔ جب گاڑی نے وسل دی اور رفتہ رفتہ چلنے لگی تو چچا عبدالباقی کچھ دیر پلیٹ فارم پر اس کے ساتھ بھاگتا آیا۔ اس کی گول مٹول پروقار اور ہنس مکھ ہاتھ ہلاتی ہوئی شخصیت گاڑی کے پلیٹ فارم سے دور تک نکل جانے کے بعد تک مجھے نظر آتی رہی۔ میری آنکھیں بھیگ سی گئیں۔ ہم خلجی بے حد جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ میں نے افسوس کیا کہ میں نے اسے اپنی کلائی کی گھڑی کیوں نہ دے دی۔

جب میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کی گرد اور سیاہی میں ملفوف گھر پہنچا تو بوڑھا آدمی برآمدے میں بیٹھا اپنی داڑھی کو وسمہ لگا رہا تھا ایک اور چھوٹا سا دبلا شخص جو قدرے ایک بھیگی ہوئی چڑیا کی طرح تھا سامنے کرسی پر ٹانگ رکھے بیٹھا ایک پلیٹ میں سے چلغوزے کھا رہا تھا۔ کسی چیز نے مجھے بتایا کہ یہی وہ ریٹائرڈ ایکسائز انسپکٹر ہے یعنی میرا ہونے والا سسر۔ میرا دل بوٹوں تک ڈوب گیا۔ ہونے والے خسروں کا ہمیشہ مجھ پر یہی اثر ہوتا ہے ہم خلجی قدرے نروس ہوتے ہیں۔

''اچھا تو آپ مجھے بتا رہے تھے کہ چک جھنڈو خان میں آپ کے پندرہ مربعے ہیں۔ آپ کے نام ہیں یا آپ کے رشتہ داروں کے نام؟'' ریٹائرڈ ایکسائز انسپکٹر میرے والد سے پوچھ رہا تھا۔

''میرے اپنے نام ہیں۔'' میرے والد نے جواب دیا۔

''گوجرانوالہ میں گویا دو کوٹھیاں ہیں آپ کی!''

''چار'' میرے باپ نے کہا۔

''آپ کا بیٹا غالباً اکلوتا ہے۔''

''ہاں''

''اب آپ کی عمر کتنی ہوگی؟''

''پچھتر سال'' میرے باپ نے فخریہ کہا۔ ''ابھی تک میرا ایک دانت نہیں ہلا۔ میں آج کل کے نوجوانوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہوں۔''

''ذیابیطس کی شکایت تو ضرور ہوگی؟'' ایکسائز انسپکٹر نے پرامید لہجے میں پوچھا۔ ''آپ شوگر ٹیسٹ ضرور کرائیں۔ بعض دفعہ پتہ نہیں چلتا۔''

اتنے میں میری موجودگی کا پتہ چلا۔ میرے باپ نے میرا ریٹائرڈ ایکسائز انسپکٹر سے تعارف کرایا۔ گفتگو غالباً کچھ اس قسم کی ہوئی۔ ''برخوردار بیٹھو آج کل کہاں ہیں آپ؟'' اس نے پوچھا۔

''میں کراچی سے آیا ہوں۔''

''کیا کرتے ہیں، وہاں کراچی میں؟''

''میں بزنس کرتا ہوں۔ امپورٹ ایکسپورٹ''

''کونسا بزنس کرتے ہیں؟''

''ڈیزل انجن، ملز، بجلی کی موٹریں، حجامت کے استرے، زیبرے''

ایکسائز انسپکٹر زیبروں پر کچھ چونکا۔ مگر پھر غالباً یہ خیال کر کے کہ زیبرے بھی کسی مشینری کا نام ہوگا، اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہوں''

''آپ کے پاس وہاں کراچی میں کونسی میک کی کار ہے۔ شیو یا پاکیٹک؟''

''میرے پاس سائیکل ہے۔ ہرکولیس 1943ء ماڈل''

ایکسائز انسپکٹر نے میرے باپ کی طرف قدرے گھور کر دیکھا جس نے اسے بتایا تھا کہ میرے پاس کار ہے۔

''آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟''

''بی اے پلکڈ ہوں۔''

''یعنی بی اے پاس نہیں کر سکے آپ؟''

''پانچ چھ سال کوشش کی تھی مگر یونیورسٹی نے ڈگری دینا مناسب نہیں سمجھا۔''

ریٹائرڈ ایکسائز انسپکٹر تو اس کے پندرہ منٹ بعد ہی پہلے سے بھی زیادہ بھیگی چڑیا لگتا ہوا اٹھ کر چلا گیا۔ میرا باپ مجھ سے بے حد خفا ہوا کہ میں نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا اور اس نے مجھے ریٹائرڈ انسپکٹر کے بینک بیلنس اور جائیداد کے متعلق بتایا۔ اس نے شکار کو بڑے حیلے اور طریقے سے پھانسا تھا۔ ریٹائرڈ ایکسائز انسپکٹر کی تو اس کے بعد کوئی خبر نہ آئی۔ ہاں میرے وہاں جانے کا یہ فائدہ ہوا کہ میں چار پانچ ہزار روپے ادھار لینے میں کامیاب ہو گیا۔ ڈیڑھ ہزار تو بوڑھے آدمی سے بعض عجیب طریقوں سے اینٹھا گیا۔ کچھ میں نے اپنے چند پرانے دوستوں سے لیا جو اب بھٹوں اور کپاس وغیرہ کے کاروبار میں خوب پیسے کما رہے تھے۔ ہم خلجی جب چاہیں کافی میٹھے اور چارمنگ لوگ بن سکتے ہیں اور ہمارے خاندان کے افراد ہمیشہ روپیہ ادھار لینے میں اچھے رہے ہیں۔

جب میں روپیہ لے کر واپس پہنچا تو چچا سے زیادہ خوش آدمی نہ ہوگا۔ اس نے کہا کہ ہم اب اپنی سکیم کو تیزی سے حقیقت بنا دیں گے۔ پہلی تو ہم نے میکلوڈ روڈ کی کئی انگریزی اور دوسری کمپنیوں کے چکر کاٹے اور ان کے مینجنگ ڈائریکٹروں سے تخلیہ میں ملاقات کی اور ان سے زیبرے فراہم کرنے کے لیے کہا۔ بہتوں نے سمجھا کہ ہم ان کا مذاق اڑا رہے ہیں اور فوراً ہمیں دفتر سے رخصت ہونے کی درخواست کی۔ بعض نے ہمیں احمقوں کا ایک بے مثل جوڑا سمجھا۔ ایک کمپنی کا ڈائریکٹر تو چچا کے سکیم کی وضاحت کرنے پر اس قدر بے صبرا اور غضب ناک ہو گیا کہ اس نے ہم سے پوچھا کہ آخر ہمارا اس طرح اس کا وقت ضائع کرنے سے کیا مطلب ہے اور ہمیں تنبیہ کی کہ اگر ہم اسی وقت وہاں سے نہ چلے گئے تو وہ اپنے چوکیداروں کو بلوا کر ہمیں باہر پھنکوا دے گا۔

''اب ایک ہی صورت ہے۔'' چچا عبدالباقی بولا۔ ''ان کمپنیوں کو بزنس کرنا ہی نہیں آتا۔ بختیار اب تم کو خود نیروبی جانا پڑے گا۔ وہاں جاتے ہی تم کو پہلے ایک شکاری ''سفری'' کا انتظام کرنا ہوگا۔ میں تمہیں رائڈر ہیگرڈ کے ایک دو ناول ''شی'' وغیرہ پڑھنے کے لیے دوں گا۔ اس سے تمہیں ایک سفاری کے انتظام کرنے کے موٹے موٹے اصولوں کا پتہ لگ جائے گا۔ پہلی چیز جو تمہیں کرنی ہوگی وہ ہے ایک اچھے قابل اعتبار زدلو مہتمم کا انتخاب جو افریقی جنگلوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ زدلو خود ہی سامان اٹھانے والے قلیوں کا انتظام کر دے گا۔ سامان میں تم ایک خیمہ، ایک سوٹ کیس اور کچھ کھانے پکانے کے برتن لے جا سکتے ہو۔ ہاں سانپوں کے کاٹے کے علاج کا بکس ساتھ ضرور رکھنا۔ تم ہر بیسویں قدم پر سانپوں سے دوچار ہو گے۔''

''میں نہیں جا رہا۔'' میں نے جواب دیا۔

آخر بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میرا جانا ہر حالت میں ناگزیر ہے اور میں نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دے دی۔ چچا

عبدالباقی اور میں نے ایئر لائن اور جہازوں کی کمپنیوں کے دفتروں میں جا کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور کمپنیوں کے سفری لٹریچر کا مطالبہ بڑے انہماک سے کیا۔ ہم یہ طے نہ کر پائے کہ نیروبی جانے کے لیے میرے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا بہتر رہے گا۔ چند دنوں میں ہر کوئی زیبروں کے خرید کے سلسلے میں میرے نیروبی جانے کے متعلق جانتا تھا اور اس کا اس قدر چرچا ہوا کہ بہت سے احباب کا خیال تھا کہ میں نیروبی سے واپس آ گیا ہوں۔ خود مجھے کبھی کبھی گمان ہونے لگتا کہ شاید میں نیروبی کا سفر کر آیا ہوں۔ کئی احباب مجھے بازار میں ٹھہرا کر میرے کراچی میں ہونے پر تعجب کا اظہار کرتے اور کہتے کہ ان کے خیال میں میں ابھی نیروبی وغیرہ میں ہی تھا۔ بے حد سنجیدہ چہروں سے وہ مجھ سے دریافت کرتے کہ میں نیروبی سے کب واپس آیا ہوں اور یہ کہ میں کتنے زیبرے ساتھ لا سکا ہوں۔ ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر نے کافی ہاؤس میں مجھ سے فرمائش کی کہ میں ''نقاد'' کے خاص نمبر کے لیے نیروبی پر ایک رپورتاژ قلمبند کروں جس میں وہاں کے سماجی اور معاشی پس منظر پر روشنی ڈالوں اور ماہنامے کے قارئین کو زیبروں کے پکڑنے کے بارے میں معلومات بہم پہنچاؤں۔

اس چرچے اور غل کے باوجود میں نیروبی نہ جا سکا۔ اول تو پاسپورٹ ہی نہ بن سکا اور پھر نیروبی کی حکومت اپنے جانوروں کو بچانے کی اہمیت کے بارے میں تیار ہو گئی تھی۔ اور اپنے ملک میں شکاریوں کے آنے پر قدغن لگا رہی تھی۔ چچا عبدالباقی کی مایوسی دیکھنے کے لائق تھی۔ مگر میں اپنے دل میں کچھ خوش اور مطمئن تھا۔ مجھے سانپوں سے بہت ڈر لگتا ہے اور رائڈر ہیگرڈ کے ناول ''شی'' کو پڑھنے کے بعد تو میں کسی حالت میں بھی افریقہ میں جانے کو تیار نہ تھا اور متحیر تھا کہ لوگ آخر وہاں رہتے کیوں ہیں۔

ایک شام کو میں چچا عبدالباقی سے ملاقات کے لیے گیا تو ایک اور شخص کو اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا خوفناک شکل کا شخص تھا اور ان شخصوں میں سے تھا جن کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کے چہرے سے ہن برستا ہے۔ مجھے یہ تو اچھی طرح معلوم نہیں کہ ہن کیا ہوتا ہے مگر اس آدمی کے چہرے سے یہ ہن ٹنوں کے حساب سے برس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی زرد اور تاتاری تھیں۔ ہونٹ موٹے اور کچھ احمقانہ تھے اور اس کی مونچھیں لمبی اور الجھی ہوئی تھیں۔ وہ لمبا گلوبند خاکی اوورکوٹ پہنے ہوئے تھا وہ غالباً مگرمچھ کے چمڑے کے اونچی ایڑی والے کیلدار فل بوٹ چڑھائے تھا۔ ایک چار بور کی رائفل اس کے سامنے میز پر پڑی تھی۔

میں اس کو دیکھ کر الٹے پاؤں جانے لگا تھا کہ چچا عبدالباقی نے مجھے آواز دی۔

''آؤ بھئی بختیار، ہمارا کام بن گیا ہے۔'' چار و ناچار کمرے میں داخل ہوا۔ چچا ایک دھوتی اور قمیص میں بڑے صوفے پر آلتی پالتی

مار کر بیٹھا تھا اور ایک مکمل معتک شانت بدھ کی طرح دکھائی دے رہا تھا جسے اس وقت نروان حاصل ہونے والا تھا۔ اس نے لمبی مونچھوں والے خوفناک اجنبی سے مجھے تعارف کرایا۔

''بھئی' اچھا ہوا تم آ گئے۔ یہ میجر اے آر مسکین ہیں بڑے مشہور بگ گیم ہنٹر ہیں چنانچہ اب پھر بگ گیم کے شکار کے لیے نیروبی پرواز کرنے والے ہیں۔ ان کو کہیں سے پتا چلا ہے کہ ہمیں زیبروں کی ضرورت ہے اور یہ اسی لیے یہاں مجھے ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ہمارے لیے وہاں سے پچاس زیبرے ہر ماہ کے حساب سے شپ کر سکتے ہیں۔ مسکین صاحب! یہ محمد بختیار خلجی صاحب میرے حصہ دار ہیں۔''

میجر نے مجھے اپنی پیلی آنکھوں سے دیکھا اور ردعمل کے طور پر سامنے رکھی ہوئی رائفل کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

میجر نے اپنی رائفل سے کھیلتے ہوئے مجھے اور چچا عبدالباقی کو مخاطب کیا۔

''ہاں تو مسٹر عبدالباقی بگ گیم ہنٹنگ کے لیے افریقہ کے گھنے زہریلے جنگلات میں کئی کئی ہفتے گھومنا پڑتا ہے۔ اگر آپ حضرات نے ٹارزن کی فلمیں دیکھی ہیں تو آپ قیاس لگا سکتے ہیں کہ یہ کام کتنے جان جوکھوں اور خطرے کا ہے۔ سفری کے انتظام میں کافی خرچ آ جاتا ہے چونکہ میں آپ لوگوں کے کام پر نیروبی جا رہا ہوں' اس لیے اصولاً تو آپ کو مجھے نیروبی جانے اور وہاں سے واپسی کا کرایہ دینا چاہیے اور وہاں مہم وغیرہ کا خرچ بھی آپ کے ذمہ ہونا چاہیے مگر میں آپ حضرات سے نہ کرایہ لوں گا اور نہ وہ خرچ جو زیبروں کی مہم کے انتظام پر آئے گا۔''

''یہ آپ کی بڑی عنایت ہے۔'' چچا عبدالباقی نے کہا۔

''یہ زیبروں کا پکڑنا سخت مشکل کام ہے۔ میں آپ حضرات کے لیے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال رہا ہوں۔ اچھا فی الحال آپ کو کتنے زیبرے درکار ہیں۔''

''ڈیڑھ سو۔'' چچا عبدالباقی بولا'' کیوں بھئی بختیار فی الحال ڈیڑھ سو کافی ہوں گے؟''

''دو قسم کے زیبرے ہوتے ہیں۔'' شکاری نے کہا۔''ایک قسم ذرا بڑھیا ہوتی ہے۔ ایک تو سفید زیبرے ہوتے ہیں جن پر سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں پھر بھورے زیبرے ہوتے ہیں جن پر سرخ دھاریاں اور ملگجی دھاریاں ہوتی ہیں۔ آپ حضرات کو کون سے زیبرے چاہئیں؟''

''ملے جلے ہوں'' چچا عبدالباقی نے کہا۔''زیادہ تر اگر سفید زیبرے مل سکیں تو اچھا ہے۔''

''ان کے لیے مجھے نیروبی سے سو میل آگے زینبو دریا میں کئی دن اور کئی راتیں سفر کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ آپ نے ''کنگ سالومنز نائنز'' اور ٹارزن کا بیٹا فلموں میں دیکھا ہوگا۔ سفید زیبرے غوما کنٹری میں پائے جاتے ہیں۔ غوما کنٹری کے لوگ سخت وحشی اور مردم خور ہیں اور سفید زیبرے کی پرستش کرتے ہیں۔ اس لیے اس خطرے کے لحاظ سے جو مجھے غوما کنٹری میں شکار کھیلنے کے لیے مول لینا ہوگا سفید زیبروں کی قیمت عام زیبروں سے زیادہ ہوگی۔''

''عام زیبروں کی قیمت کتنی ہوگی؟''

''عام زیبرے آپ کو غالباً چار سو روپے جوڑے کے پڑیں گے اور سفید کوئی آٹھ سو کے۔ آپ حضرات کل دس بجے میرے ہمراہ ہماری کمپنی افریقین ٹریڈنگ کمپنی میں آیئے۔ میرا بڑا بھائی اس کا مینجنگ ڈائریکٹر ہے۔ آپ ٹرمز وغیرہ وہیں طے کر سکتے ہیں۔''

اس کے بعد اس نے ہمیں اپنے افریقی سفروں کے نہایت دل دہلا دینے والے قصے سنائے۔ باتوں کے دوران میں وہ کئی دفعہ جوش میں آ جاتا اور ہمیں جانور تصور کر کے ہم پر رائفل سے شست باندھ دیتا۔

''ہاں تو چیتا بس وہاں بیٹھا تھا جہاں بختیار صاحب آپ بیٹھے ہیں۔ میں نے فوراً شست باندھی۔ اور ڈزڈز''

چچا عبدالباقی اور میں اسے نیچے سڑک پر چھوڑنے کے لیے آئے۔ چچا عبدالباقی چاہتا تھا کہ میں میجر کو شہر میں لے جا کر کسی اچھے ریسٹوران میں کھانا وغیرہ کھلاؤں اور سینما وغیرہ پر لے جاؤں۔ چچا نے مجھے ایک طرف لے جا کر کئی ایسے طریقے بتائے جن سے میجر مسکین پر اپنے روپے خرچ کر سکتا تھا۔ میں نے چچا کا ان مفید مشوروں کے لیے شکریہ ادا کیا اور میجر ایک گزرنے والی بس میں دوڑ کر چڑھ گیا۔

''میجر ہے اس کام کے لیے ٹھیک آدمی'' چچا عبدالباقی نے کہا۔ ''میں نے تمہیں کہا تھا کہ سب کچھ عبدالباقی پر چھوڑ دو۔''

دوسری صبح میجر اے آر مسکین چچا عبدالباقی کے مکان پر آیا اور ہمیں اپنے ساتھ اپنی کمپنی کے دفتر میں لے گیا۔ دفتر کھارادر میں ایک غیر اہم گلی میں تھا اور باہر ایک نئے رنگے ہوئے سائن بورڈ پر ''افریقن برادران لمیٹڈ'' لکھا تھا۔ میجر اے آر مسکین تھوڑی دیر کے لیے ہمیں باہر چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔ ایک بڑے کمرے میں جو ایک دفتر کی بجائے ایک رہائشی ڈرائنگ روم سے زیادہ مشابہ تھا۔ ایک بے حد موٹا آدمی میز پر کہنیاں ٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھ کر آدمی کو اکھاڑے اور دنگل کا خیال آتا تھا۔ یہ آدمی ایک رنگین چھپکلیوں والی بوشرٹ پہنے تھا اور ایک بڑے خوش مذاق دیو کی طرح اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی آلوچوں، بیسیوں اور خوبانیوں کی کوئی آدھ درجن پلیٹوں کی صفائی کرنے میں مشغول تھا۔ اس کی دونوں گالیں فواکہات

سے پھولی ہوئی تھیں اور اس کے جبڑوں کا کام کرتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک چھوٹی میز پر ٹائپ رائٹر کے پیچھے ایک سیاہ چوہی نما عیسائی ٹائپسٹ لڑکی بیٹھی تھی اور وہ اس کا ٹائپ رائٹر اس کمرے میں ایک کاروباری فضا پیدا کرنے کی ہلکی سی کوشش کر رہے تھے۔

خوش مذاق دیو نے کھڑے ہو کر چچا عبدالباقی اور مجھ سے پرجوش طریقے پر ہاتھ ملایا۔ اس کے چہرے پر اس بڑے چیمپئن پہلوان کا سا مربیانہ انداز تھا۔ جو اکھاڑے میں چھوٹے اور معمولی پہلوانوں سے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے معانقہ کر رہا ہو۔ اس نے بیٹھنے کی دعوت دی اور ہمیں فواکہات میں شرکت کے لیے کہا۔ میز پر اس وقت فواکہات کا صفایا ہو چکا تھا۔

میجر مسکین نے میز پر بیٹھے ہوئے اپنے بھائی سے ہمارا تعارف کرایا۔

''بھائی تسکین! ان صاحبوں کو زیبروں کی ضرورت ہے۔ یہ ان کو گاڑیوں کے آگے جوتنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو بتایا ہے کہ میں خود چند دنوں میں نیروبی جا کر جلد از جلد ان کو زیبرے شپ کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ اب یہاں ہم سے بزنس کی ٹرمز وغیرہ پر بات چیت کرنے آئے ہیں۔''

تسکین نے ہمیں ایک کاروباری خوش طبعی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ آپ حضرات مجھے اس ملک میں دو واحد سمجھدار کاروباری آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی۔ زیبروں کو گاڑیوں میں جوتنے کا خیال خود مجھے آیا تھا۔ مگر میں اور مسکین امپورٹ کے کام میں اس درجہ مصروف ہیں کہ ہم اور کسی بزنس میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتے۔ آپ کی سکیم نہایت مبارک ہے۔ زیبروں میں روپیہ ہی روپیہ ہے۔

میجر مسکین نے کہا۔ ''میں نے ان کو سفید زیبرے کے پانچ سو اور بھورے کے لیے ڈھائی سو روپے الیف او آر کراچی پرائس کوٹ کی ہے۔''

تسکین نے ہمیں پرجوش طریق سے یقین دلایا۔ ''حضرات! یقین رکھئے آپ اس قیمت پر گویا زیبروں کو مفت حاصل کر رہے ہیں۔ ڈھائی سو روپے میں تو آج کل زیبرا تو زیبرا گدھا بھی نہیں ملتا۔ ہم نے اگلے روز چودھری سرکس کمپنی کے لیے دو سیاہ زیبروں کا ڈیڑھ ہزار کا آرڈر بک کیا ہے چونکہ آپ حضرات ہم سے پہلی بار بزنس کر رہے ہیں اور آپ کا آرڈر بھی بڑا ہے۔ اس لیے آپ کو بہت کم قیمت بتائی گئی ہے۔

تھوڑی سی اور بات چیت کے بعد چچا عبدالباقی افریقن برادران سے تیس سفید اور سیاہ زیبروں کا آرڈر بک کرنے پر تیار ہو

گیا۔ یہ آرڈر کوئی بیس ہزار کا تھا اور افریقن برادران کی بزنس کی شرائط یہ تھیں کہ آرڈر دیتے وقت کل رقم کا ایک چوتھائی حصہ پیشگی ادا کر دیا جائے۔ افریقین برادران ہمارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے اور آخر وہ اس پر رضامند ہو گئے کہ دو ہزار روپیہ پیشگی ادائیگی پر ہمارا آرڈر بک کر لیں گے۔

''اور ہم آپ سے ایک اور رعایت کرتے ہیں۔'' تسکین نے کہا۔ ''ہماری شرائط میں ہے کہ بقیہ رقم اس وقت ادا کرنی پڑتی ہے جب بندرگاہ سے ہمارے پاس انوائس پہنچ جائے کہ مال لاد دیا گیا ہے۔ آپ کو بقیہ رقم اس وقت دینا ہوگی جب زیبرے یہاں ہمارے گودام میں پہنچ جائیں گے۔ ایسی شرائط آپ کو کراچی بھر میں کوئی امپورٹر نہیں دے گا۔''

''آپ زیبروں کو انشور وغیرہ بھی کرانا چاہتے ہیں؟'' میجر مسکین نے کہا۔

''ضرور'' چچا عبدالباقی نے جواب دیا۔ ''میرا خیال ہے انشور کرانا بہتر رہے گا۔''

''پیکنگ آپ کیسی چاہتے ہیں؟'' تسکین نے پوچھا۔

''پیکنگ کا کیا مطلب؟'' چچا عبدالباقی بولا۔ ''کیا آپ کا مطلب ہے کہ زیبروں کو پیک کیا جائے گا؟''

''یقیناً یقیناً'' تسکین بولا ''پیکنگ کے بغیر تو ان کی کھال کی شفافیت اور خوبصورتی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ آخر زیبرے ہیں کوئی گھوڑے اور گدھے تو نہیں کہ جیسے ہیں ویسے لاد دیا۔ عموماً ان کو موی کپڑے میں ملفوف کر کے جہاز پر لادا جاتا ہے۔''

''ہاں تو پیکنگ بھی کرائی جائے۔'' چچا عبدالباقی نے کہا۔

عیسائی ٹائپسٹ لڑکی نے ہمارا آرڈر بک کیا اور میں چچا عبدالباقی کو وہیں چھوڑ کر گھر سے دو ہزار روپے پیشگی کی رقم لانے کے لیے گیا۔ جب میں واپس آیا تو چچا عبدالباقی ٹائپسٹ لڑکی کی بغل میں بیٹھا تھا اور ٹائپ رائٹر کی کلک کلک ظاہر کرتی تھی کہ ہمارا آرڈر تیزی سے ٹائپ ہو رہا ہے۔ تسکین ٹیلیفون ٹیلیفون کا ریسیور اٹھا کر نیروبی آفس کو ٹرنک کال کر رہا تھا۔ ''سناؤ' کیا کہا؟ دس شیر شپ ہو گئے؟ کب آئے؟ ابے میں پوچھتا ہوں کب کئے؟ ببر تھے نا؟ اور چیتے؟ کتنے؟ چھ؟ ابے بارہ کا آرڈر بھیجا تھا۔ پکڑے نہیں گئے' ابے چیتے نہیں پکڑے گئے؟ اچھا اور چاچی کا کیا حال ہے؟ زیبروں کا کیا حال ہے؟ ابے زیبرے بھئی زیبرے بکرے نہیں' زے۔ب۔رے۔ کیا کہا؟ زمبی کے اوپر چار سو میل چلے گئے ہیں۔ اچھا میں مسکین کو بھیج رہا ہوں۔ سفری کا انتظام کر دینا۔ زیبرا گاڑیوں کے لیے یہاں زیبرے چاہئیں۔ ابے وہ لنگور' جو تم نے پچھلی شپمنٹ میں بھجوائے تھے انہیں انشور کیوں نہیں کیا؟ تم بھی نرے لنگور ہو۔ راستے میں جہاز پر سے پانچ تو سمندر میں چھلانگ لگا گئے۔ اب ان کے پیسے تیرا باپ دے گا۔ چودھری سرکس کمپنی

والے روزنامک میں دم کرتے ہیں۔کیا کہا.....''

آرڈر آخر بک کر دیا گیا۔افریقین برادران سے آرڈر کی ایک کاپی اور دو ہزار کی رسید لے کر ہم باہر آ گئے۔چچا عبدالباقی دونوں مسکین اور تسکین کے لیے تعریف اور تحسین سے پر تھا۔

''بزنس مین فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ کس چیز میں آج کل روپیہ ہے۔''اس نے کہا۔''تم نے دیکھا زیبروں کے نام ہی سے تسکین چونک پڑا۔بختیار! میں تمہیں بتاؤں اس شخص تسکین کی کھوپڑی میں واقعی کاروباری دماغ ہے۔یہ دونوں بھائی ہمارے لیے خدا نے رحمت کے فرشتے بنا کر بھجوائے ہیں۔

ہم چوتھے پانچویں روز افریقین برادران میں زیبروں کے متعلق پتہ کرنے جاتے۔تسکین کبھی دفتر میں ہوتا اور کبھی باہر۔مگر اس کی ٹائپسٹ مس میسی وہیں ہوتی۔پہلی بار ہمیں بتایا گیا کہ میجر اے آر مسکین نیروبی میں پہنچ گیا ہے اور سفری کے انتظام کرنے میں مشغول ہے۔دوسری دفعہ جانے پر پتا لگا کہ وہ زولو شکاریوں کی ایک پارٹی کے ہمراہ دریائے زمبیی میں ہوچی ٹوچی کنٹری کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ایک مہینہ تک وہ وہیں تھا اور چچا عبدالباقی اور میں کچھ فکرمند رہے کہ کہیں اے آر مسکین کو ہوچی ٹوچی کنٹری کے مردم خور حبشی بھون کر نہ کھا گئے ہوں۔ہمیں اے آر مسکین کے بھونے جانے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اپنے زیبروں کی۔آخر ایک دن افریقین برادران جانے پر تسکین نے ہمیں اطلاع دی کہ تھوڑی دیر ہوئی اس نے نیروبی سے ایک ٹرنک کال موصول کی ہے۔مسکین دو سو زیبروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا ہے اور ان کی شپنگ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔دو دن بعد ہمیں بتایا گیا کہ زیبرے ایس ایس ڈھمرا سے شپ ہو چکے ہیں اور دو ہفتے کے اندر اندر کراچی بندرگاہ میں پہنچ جائیں گے۔چچا عبدالباقی اور میں اس خبر سے دیوانے ہو گئے اور چچا کی کوٹھی کے پچھواڑے ایک احاطے کو زیبروں کے قیام کے لیے صاف کر دیا گیا۔

دو ہفتے کے بعد افریقین برادرز میں جانے پر تسکین ہنس ہنس کر ملا۔

''آپ کے زیبرے آ گئے ہیں۔''

''کہاں ہیں؟''ہم نے بیتابی سے پوچھا۔

''صبر تو کیجئے۔''تسکین بولا۔''میرا کلیرنگ ایجنٹ آج صبح ان کو کلیر کر کے لے آیا ہے۔چونگی ان پر بہت پڑ گئی ہے مگر وہ سب نہایت چست حالت میں ہیں۔اس وقت وہ کلیرنگ ایجنٹ کے گودام میں ہیں۔ہاں ایک زیبرا میں نے بطور نمونہ اپنے گودام میں منگوالیا ہے۔آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔''